Monthly
Arzang
Lahore
راوی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کے 25 کامیاب سال
ماہنامہ
ارژنگ
لاہور
مئی ۲۰۲۵ء
مدیر اعلیٰ:
عامر بن علی
مدیران:
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

CamScanner

عورت مارچ کے نعرے لگا کر خود کو منوانے کی قائل نہیں: بینا گوئندی

صدر اوباما کے ساتھ تین روزہ کانفرنس میں اسلام کی نمائندگی کا شرف ملا

کالم نگار، کہانی کار، سفرنامہ نگار، محقق و نقاد اور معروف شاعرہ

بینا گوئندی

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر،
کالم نگار اور سفرنامہ نگار **عامر بن علی** کی خصوصی گفتگو

سیاست کی آرٹیفیشل انٹیلیجنس کے اس دور میں ضرورت کم ہو رہی ہے

س بچپن کہاں گزرا؟ گردوپیش کے حالات کیسے تھے؟

ج سرگودھا میں پیدا ہوئی۔ مڈل کلاس گھرانہ، والدین کو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا اور خاص طور پر والد محمد یعقوب گوئندی کو شاعری سے بے انتہا لگاؤ تھا؛ سرگودھا میں وہ سالانہ مشاعروں کا اہتمام کرتے یوں بہت چھوٹی عمر میں بے شمار نامور شعراء کو سننے اور ملنے کے مواقع میسر ہوئے۔ چھ بہن بھائی، تین چھوٹی بہنیں اور دو بڑے بھائی ہیں۔ سرگودھا کانونٹ سکول سے نمایاں کامیابی سے میٹرک کیا، میری لاہور میں آگے پڑھنے کی خواہش پر والدین نے لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔ یوں لاہور نے ہمیں اپنے اندر کیا سمایا وہ دل کی دھڑکن کی طرح دنیا جہان میں جہاں بھی رہی ساتھ ساتھ سفر میں رہا۔ لاہور کالج (لاہور کالج یونیورسٹی) سے ایف ایس سی اور بی ایس سی مکمل کی۔ ادھر شبنم شکیل میری اردو کی استاد تھیں۔ ادھر ہی اشفاق احمد اور امجد اسلام امجد سے تقریری مقابلے میں ملاقات ہوئی۔ اس زمانے میں مشرق اور خبریں اخبار میں لکھتی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی باٹنی کیا۔ زمانہء طالب علمی میں ریڈیو پاکستان پر اردو کی خبریں پڑھتی رہی۔

س ادب سے شوق کی ابتدا؟

ج سکول سے انگریزی میں نظمیں لکھتی۔ کالج میں اردو میں شاعری اور چھوٹی چھوٹی سائنسی کہانیاں لکھتی۔ ماسٹرز میں "چشم بینا" کے نام سے کالم لکھنا شروع کیا آج کل پاکستان اخبار میں لکھتی ہوں۔ مجھے لکھنے سے زیادہ پڑھنے کا شوق تھا؛ خلیل جبران کو دسویں میں پڑھ لیا تھا؛ مگر جب جب بھی کتاب کو دوبارہ پڑھا وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تفہیم بدلتی رہی۔ ماں باپ نے نام روبینہ نازلی گوئندی مگر قلمی نام کالج سے ہی مجھے اشفاق احمد نے بینا گوئندی مختصر کر کے دے دیا۔ بظاہر ہنستی مسکراتی بینا بچپن سے ہی بہت غور و فکر کرتی اپنی قلبی وارداتوں کو گہرائی اور گیرائی سے محسوس کرتی۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر انسان عملی طور پر زندگی میں شامل نہیں تو زندہ ہی نہیں؛ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جب سے آنکھ کھولی کسی نا کسی محاذ پر ذمہ داریاں نبھائی ہیں۔ دوران تعلیم free lance لکھتی، ریڈیو، ٹی وی کے مشاعروں میں شمولیت کرتی تو کم سہی مگر معاوضہ ملتا تھا؛ اس کے علاوہ ادبیات میں چھپنے پر سو روپے ملا کرتے؛ وہ اعزازیے دل پر نقش ہیں۔ ڈاکٹر افضل، احمد فراز، ڈاکٹر وحید قریشی، منیر نیازی، بانو قدسیہ، ڈیوڈ میتھیوز، قدرت اللہ شہاب سے لے کر واصف علی واصف سے بہت ملاقاتیں رہتیں اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ مجھے عورت کو مضبوط اور empower تو دیکھنا ہوتا تھا مگر ذاتی طور پر میں اپنے آپ کو femininism کا نعرہ لگا کر منوانے کی قائل نہیں۔ مجھے دستور کے مطابق عورت کو عورت کے دائرے میں مضبوط انسان سمجھ کر آگے بڑھنا پسند ہے۔

بقیہ اندرونی صفحات پر

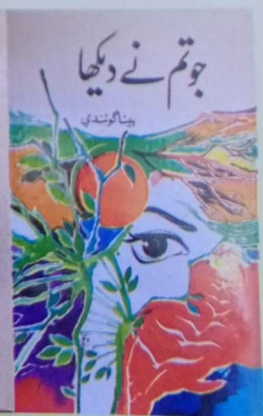

راوی فاؤنڈیشن کے زیراہتمام مسلسل اشاعت کے 25 کامیاب سال

ماہنامہ ارژنگ لاہور

MONTHLY Arzang LAHORE

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

مئی 2025ء جلد 26 شمارہ 5

مدیر اعلیٰ
- عامر بن علی

مدیران
- حسن عباسی
- لبنیٰ صفدر

مجلس ادارت
- ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

مجلس مشاورت
- ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ: زرناب کمپوزنگ 0321-4730769

فوٹوگرافر: نعمان حسن 0333-4918383

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4489310

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے نام اور شناختی کارڈ نمبر پر مبلغ -/1500 روپے بذریعہ موبی کیش رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔

حسن محمود: 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر: 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت ، 2

مضامین:

- اقبال اور عہد حاضر / ڈاکٹر محمد خان اشرف ، 4
- اقبال کی مذہبی رواداری / محمد یوسف وحید ، 6
- غالب جو ایک شاعر تھا عالم میں انتخاب / امجد محمود چشتی ، 13
- اسلاف کی روایت کے امین جسٹس (ر) میاں نذیر اختر / حسن عباسی 15
- ابیاتِ سندھی کا ادبی تجزیہ / مرزا کاظم بیگ ، 20
- نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں سے ملیں / پروفیسر نور کمال شاہ ، 22
- گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست / سرور عالم راز ، 24
- ڈاکٹر وحید الزماں طارق: ایک ہمہ جہت شخصیت / علامہ عبدالستار عاصم 27
- راجا منظر حسن منصور...... شخصیت و ادبی خدمات! / مرزا کاظم بیگ 30
- زبان و ادب کے فروغ میں صحافت کا کردار / ثوبیہ شاہ ، 32

شعری گوشے: افضل گوہر ، اجمل ساقی ، سید مبارک لی 37 تا 39

سفرنامہ

- پت جھڑ کی چاپ / عامر بن علی ، 40

خصوصی گوشۂ غزہ و فلسطین:

- غزہ کا المیہ اور اسرائیل مظالم: انسانیت کی چیخیں / انجینئر ظفر محی الدین 41
- غزہ کا نوحہ / لبنیٰ صفدر ، 43
- جنید آذر ، عامر سہیل ، عبدالوحید بسمل ، شہزاد وپ ، 45

افسانے:

- سفید گلاب / بلقیس ریاض ، 46
- سیاہ خیمے کی نحوست / کلیم خارجی ، 49
- دائرہ / عالیہ ذوالقرنین ، 52
- ادبی تقریبات ، 55
- شہر میں گاؤں کے پرندے / روداد: ڈاکٹر ساجد علی ، 54
- نامہ ہائے احباب ، 56

Far East Marketing Co.

Samana Mansion 6.5 Koanp-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 108-0003 Japan
Email: femc1@hotmail.com

حمد

اے محمدؐ کے ربّ
تیری سب پر نظر
سب کو تیری طلب
اے محمدؐ کے ربّ
جنبشِ چشم و لب
گردشِ روز و شب
دورِ لطف و طرب
عہد زیرِ غضب
غیب و موجود سب
سب ہے تیرے سبب
اے مسبّب لقب
جز ترے ہم کو اَب
کس کی ہوگی طلب
اے محمدؐ کے ربّ
نجم و خورشید و ماہ
مسجد و خانقاہ
سنگِ در ، سنگِ راہ
تخت و تاج و کلاہ
خواجۂ جاں پناہ
تیری ہر جلوہ گاہ
اعتبارِ نگاہ
مطلعِ عزّ و جاہ
بارگاہِ ادب
اے محمدؐ کے ربّ
بزم تیرا جمال
رزم تیرا جلال
مرکزِ اتصال
باہمہ لایزال
تیری کیا ہو مثال
بہرِ ہر خستہ حال
صرف تیرا خیال
چارۂ ہر ملال
ردِّ رنج و تعب
اے محمدؐ کے ربّ
کارِ دنیا و دیں
یہ مکاں یہ مکیں
یہ یسار و یمیں
یہ زماں یہ زمیں
یہ سپہرِ بریں
تجھ سے سب بالیقیں
اے حیات آفریں
تو کسی سے نہیں
تیری قدرت عجب
اے محمدؐ کے ربّ
کیا گدائے حرم
کیسے دارا و جم
کچھ جدا ، کچھ بہم
ہر جبیں بیش و کم
تیرے در پر ہے خم
تیرا دستِ کرم
جھولیوں کا بھرم
اے خدائے عجم
اے الٰہِ عرب
اے محمدؐ کے ربّ
عرصۂ بحر و بر
مزرعِ خشک و تر
دورِ شمس و قمر
قلبِ جن و بشر
اپنے مقدور بھر
عجز کی راہ پر
سب ہیں گرمِ سفر
تیری سب پر نظر
سب کو تیری طلب
اے محمدؐ کے ربّ
حاصلِ جستجو
ہر بُنِ مُو میں تُو
ہر لبِ آب جو
تیری ہی گفتگو
تجھ سے ہے کُو بہ کُو
اعتبارِ نمو
تیرا نامِ نکو
پھول میں رنگ و بو
برق میں تاب و تب
اے محمدؐ کے ربّ
اے مرے کردگار
کس کو تجھ بن قرار
سبزہ و برگ و بار
خاک و خاشاک و خار
نغمہ خوانِ بہار
تیرا ہر شاہکار
تیرا سجدہ گزار
کیا ترہ کیا خیار
کیا ثمر کیا عنب
اے محمدؐ کے ربّ

مصدرِ کائنات
تیری جملہ صفات
شانِ اظہارِ ذات
برسرِ شش جہات
برق رو سالمات
ذرّے مع ذرّیات
منظرِ ممکنات
رہ گزارِ حیات
تجھ سے روشن ہے سب
اے محمدؐ کے ربّ

حسنِ بے خال و خد
قامتِ بے جسد
تو ازل ، تو ابد
تو احد ، تو صمد
رازقِ نیک و بد
قدرِ داد و ستد
ماورائے خرد
مصطفیٰؐ ایک حد
ایک حد بولہب
اے محمدؐ کے ربّ

عصر و اعیان ہیں
زیست کی جان ہیں
عدل و احسان ہیں
حق کا عرفان ہیں
روحِ قرآن ہیں
سب کا ایقان ہیں
میرا ایمان ہیں
تیری پہچان ہیں
تیرے طٰہٰ لقب
اے محمدؐ کے ربّ

حنیف اسعدی

نہ دل پہ بوجھ رہے گا نہ امتحان میں جان
درود پڑھتے رہو، جب تلک ہے جان میں جان
یہ کس کا نام لیا ، روشنی اُترنے لگی
یہ کس کا ذکر چلا ، پڑ گئی زبان میں جان
اُٹھانا بوجھ کوئی کم نہیں تھا قرآں کا
نہ تھی زمین میں طاقت ، نہ آسمان میں جان
حضورؐ، حرفِ تلطّف کہ بات بن جائے
حضورؐ بوئے تبسم کہ آئے جان میں جان!
کبھی میں نعت پڑھوں اور کبھی سلام سنوں
کبھی دہن میں ہو میرے کبھی ہو کان میں جان
خوشا وہ سانس جو آئے نبیؐ کی یاد لیے
خوشا کہ مجھ سے ہو رُخصت نبیؐ کے دھیان میں جان
بس ایک نامؐ سے چلتا ہے کاروبارِ حیات
بس ایک فردؐ سے باقی ہے خاندان میں جان

منیر سیفی

کیا خوب اُٹھیں مسجد نبویؐ میں گھٹائیں
کچھ ان کے مقابل نہیں جنت کی ہوائیں
جس روز سے ہے سامنے سرکارؐ کا روضہ
بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں اللہ کی عطائیں
جو زخم زمانے کی شقاوت نے دیا ہے
آ قلبِ حزیں رحمتِ عالمؐ کو دکھائیں
ایمان ہے ایقان ہے زم زم کے اثر سے
ہو جاتی ہے لاریب علالت سے شفائیں
پرنور ہیں پرکیف ہیں جاں بخش ہیں اتنی
رگ رگ میں سمائی ہیں مدینے کی فضائیں
دربانو! پڑا رہنے دو سرکارؐ کے در پر
برداشت نہ ہوں گی یہ جدائی کی سزائیں
ہیں لوح و قلم اس کے بقول حضرتِ اقبال
کرتا ہے جو ہر دن محمدؐ سے وفائیں
سرکارؐ کے قدموں میں جو پہنچا ہے یہ عاصی
دیتا ہوں شب و روز میں راشدؔ کو دعائیں
قربان ہے اُس ذاتِ پیمبرؐ پہ تفاخر
کیں جس نے عطا خون کے پیاسوں کو قبائیں

تفاخر محمود گوندل

ہو نہ دوزخ سے رہائی بن ثنائے مصطفیٰؐ
جادۂ جنت کی ہے ضامن ثنائے مصطفیٰؐ
کر دیا مجھ کو ثنائے دیگراں سے بے نیاز
کس قدر ہے مجھ پہ مستحسن ثنائے مصطفیٰؐ
افتخارِ اہلِ تقویٰ ، نازشِ اربابِ حق
امتیازِ بندۂ مومن ثنائے مصطفیٰؐ
نفس کو تابندگی دے روح کو روشن کرے
جگمگائے ظاہر و باطن ثنائے مصطفیٰؐ
نسخۂ اکسیر و شافی ہے صفائے قلب کا
اے عبادِ قانت و موقن ثنائے مصطفیٰؐ
صرف لب کو مت ہلا خونِ جگر بھی صرف کر
صرف لفظوں سے نہیں ممکن ثنائے مصطفیٰؐ
بڑھ رہا ہوں اب تو میں پیرانہ سالی کی طرف
کر رہا ہوں جب سے تھا کمسن ثنائے مصطفیٰؐ
عرش پر ہیں قدسیانِ نیک خو محوِ سلام
فرش، پر کرتے ہیں انس و جن ثنائے مصطفیٰؐ
گو وفاداری بدلنا شیوۂ یاراں رہا
ہم نے کی ہر دور میں لیکن ثنائے مصطفیٰؐ
کاش اُس دن ہی سے پہلے موت آ جائے مجھے
میں نہ ارقمؔ کر سکوں جس دن ثنائے مصطفیٰؐ

ڈاکٹر محمد افتخار الحق ارقم

اقبال اور عہدِ حاضر

ڈاکٹر محمد خان اشرف

(پس صداقت (Post Truth) عہد میں اقبال کی معنویت): علامہ اقبال پاکستانی قوم کے لیے ایک روشن ستارہ ہیں۔ وہ نا صرف نشانِ راہ اور عزم سفر دینے والے تھے۔ بلکہ آزادی کے سفر میں بانگ درا بھی تھے اور اب انھیں نشان و مقام منزل دکھانے والا بھی تصور کیا جاتا ہے۔ مفکر پاکستان نے سب سے پہلے علیحدہ وطن اور جداگانہ قومیت کا راستہ دکھایا اور برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کو آزادی اور آزاد وطن حاصل کرنے کا پیغام دیا۔ اپنی شاعری سے ان کے عزم و حوصلہ کو بلند کیا۔ جس کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمانوں نے قائداعظم کی رہ نمائی میں پاکستان کے خواب کو ایک حقیقی تعبیر عطا کی اور علیحدہ وطن حاصل کیا۔ گو اقبال اپنے خواب کی حقیقی شکل نہ دیکھ سکے کہ ان کی وفات ۱۹۳۸ء میں ہو گئی تھی لیکن ان کی شاعری سب کے لیے حوصلے اور عزم کا سہارا رہی۔

آج پاکستان کو وجود میں آئے ہوئے ۷۵ سال کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن ہم آج بھی اقبال کے پیغام میں اپنے لیے رہ نمائی اور سمت نمائی تلاش کرتے ہیں۔ اس عرصہ میں بہت سا پانی پلوں سے گزر چکا ہے۔ دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم دیکھیں آج کی دنیا اقبال کے عہد سے کس طرح اور کتنی مختلف ہے۔ انسانی وجود کے سوتے جس مقام پہ آج کھڑے ہیں اور جس سمت عام پر تمام دنیا جا رہی ہے۔ اس میں اقبال کے پیغام اور فلسفے کی کیا اہمیت اور معنویت ہے؟

اس سلسلے میں مجموعی طور پر عملی، تہذیبی اور فکری تناظر کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور اس تناظر میں جہت نمائی میں بدلتے ہوئے انسانی فکر اور تہذیبی عوامل کو سامنے رکھ کر اپنے مقام اور سمت کا تعین ہمیں اقبال کی بہتر تفہیم میں مدد دے گا۔ اقبال نے خود کہا تھا:

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رُسوائی تدبیر دیکھ

اقبال کا عہد: اقبال کا عہد ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی اور محرومی کا عہد تھا۔ اقبال انیسویں صدی کے اختتامی عشروں سے بیسویں صدی کے ابتدائی ادوار میں (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) زندہ رہے۔ یہ عہد مسلمانوں کی ابتلا اور مصیبت کا عہد تھا۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت ۱۸۵۷ء میں ختم ہو چکی تھی اور تاج برطانیہ کی حکومت مسلط تھی۔ وہ معاشی، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی ہر لحاظ سے ہی پسماندہ اور زوال پذیر تھے لیکن یہ سب صرف ہندوستان ہی میں نہ تھا، دنیا بھر میں مسلمان پس ماندہ اور زوال کا شکار تھے اور ترکی کی حکومت کا بھی یورپ کے مردِ بیمار کے نام سے یاد کیا جا رہا تھا لیکن دوسری طرف یورپ اور مغربی ممالک تہذیب و تمدن اور علومِ فنون کے ایک نئے عروج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ علم اور ہنر میں ان کی ترقی نے انھیں سامراج توسیع کے ایک نئے عروج کی طرف گامزن کر دیا تھا۔ اس عہد میں مغرب سائنسی اور ٹیکنالوجی میں نئی فتوحات حاصل کر رہا تھا۔ ذرائع رسل وحمل میں ریل، فانی جہاز، ہوائی جہاز اور دوسرے ذرائع نے سفر کو آسان بنا دیا تھا اور دنیا کی حدود سکڑنے لگی تھی۔ ادویات میں نئی دریافتوں نے پرانی لاعلاج بیماریوں اور وباؤں پر قابو پانے کی اُمید پیدا کر دی تھی۔ زراعت اور صنعت کی ترقی نے فارغ البال اور بہتری کی اُمیدیں پیدا کر دی تھیں۔ غرض مجموعی طور پر انسان علم و ہنر میں نئی دنیاؤں کی طرف گامزن تھا۔ اس لیے انسانی فکری تاریخ میں اس کو جدیدیت کا عہد کہا گیا گو مسلمان ہر جگہ پس ماندہ اور زوال آمادہ تھا۔

اقبال نے اس درد کا گہرا تجربہ کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو دوبارہ عزم نو اور ہنرمندی کا درس دیا۔ اس نے ”خودی“ اور فقر کا نعرہ لگایا اور کہا:

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو ہونے پھر درگاہ حق سے ہونے والی ہے
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

اور جب سلطنت عثمانیہ یعنی ترکی کو شکست دوچار ہونا پڑا تو اس موقع پہ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

اگر عثمانیوں پہ کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کام جہاں بینی
جگر خون ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اور اس موقع پہ انہوں نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مضطرب گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے

اقبال کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور بیسویں صدی کے نصف تک ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنی آزاد سلطنت حاصل کر لی اور اس لمحے کے بعد دیگرے تمام مسلمان ممالک نے، مغربی استحصال سے آزادی حاصل کر لی۔ زندگی اور ترقی کی دوڑ میں

ان کے (مغرب) کے شانہ بہ شانہ آگے بڑھنے کی اُمید بیدار ہوگئی اور ساتھ یہ بھی کہ جس ملت اسلامیہ کا خواب اقبال نے دیکھا تھا بھی وجود میں آ سکے گی، لیکن اب ممکن نہ ہو سکا۔ اس سلسلے میں تمام تر کاوشیں منزل سے دور رہیں۔ صرف اسلامی ممالک کی تنظیم کی ایک ڈھیلی ڈھالی صورت وجود میں آئی جو کوئی خاص طاقت اور اثر نہیں رکھتی۔ اس کے ساتھ ہی دنیا پہ واضح ہو گیا کہ 'جدیدیت' کے دور میں بس فطرت پر انسان کے غلبے کے جو خواب دیکھے گئے تھے۔ ان کی تعبیر نہایت تلخ نکلی۔ انسان نے علم اور ہنر، سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت فطرت کو تسخیر کرنا شروع کیا تھا، لیکن جلد ہی انسان پہ واضح ہو گیا کہ اس کی ایک حد ہے اور یہ کہ انسان خود بھی اس فطرت کا حصہ ہے۔ فطرت کی تسخیر، ماحول پہ غلبہ پانا دراصل اپنے ماحول دنیا میں مسکن کو برباد کرنے کے مترادف ہے اور اگر ماحول اور مسکن برباد ہو جاتا ہے تو انسان کا اپنا مستقبل اور وجود خطرے میں ہوگا۔ لہٰذا جلد ہی پس بیں انسانوں نے اس سے خبردار کرنا شروع کر دیا۔ ادھر ماحول نے اپنی بربادی کا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ پاکستان میں موجودہ سیلاب اسی ماحولیاتی عدم توازن کا نتیجہ ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو دنیا میں دیگر ممالک کو بھی اس کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اقبال نے اپنی شاعری میں مغرب کی تہذیب کے زوال کی پیشین گوئی کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

لیکن پیشین گوئی اخلاقی اور تہذیبی بنیاد پہ تھی مگر اسے سائنس اور ٹیکنالوجی تک بھی پھیلایا جا سکتا ہے۔ دانش ورانہ اور فکری تاریخ میں بیسویں کے نصف آخر کو پس جدیدیت کا نام دیا گیا ہے۔ جدیدیت دراصل میکانکی ترقی کا عہد تھا۔ پس جدیدیت میں الیکٹرانکس نے عروج حاصل کیا۔ کمپیوٹر، ٹیلی ویژن کی ایجاد آئی ٹی کی ترقی اور نینو ٹیکنالوجی نے انسانی آسانی کی حدود کو لامتناہی کر دیا۔ انسان دوسرے سیاروں کی تسخیر کی طرف چل دیا۔ اس میں مغرب اور اہل یورپ کا حصہ زیادہ ہے۔ اسلامی دنیا کا اس میں حصہ بہت کم ہے۔ دراصل اس ٹیکنالوجی کے انقلاب نے دوسری بہت سی حدود کو بھی محدود کر دیا ہے۔ جغرافیائی اور نظریاتی بنیادیں منہدم ہوتی جا رہی ہیں۔ عالم گیریت ایک سیلاب کی طرح اضلائی، علاقائی، تہذیبی، تمدنی، لسانی حدود و قیود کو بتدریج کم زور کرتی جا رہی ہے۔ انسان اب دنیا بھر میں بطور انسان کے وجود اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس کے بغیر ماحولیاتی ٹیکنالوجی کے انقلاب و اثراب کا مقابلہ نہ ہو سکے گا۔

اکیسویں صدی اس سے ایک قدم آگے بڑھ گئی ہے۔ اس عہد میں کتاب اور لکھی ہوئی چیز کا کلچر ختم ہوتا جا رہا ہے اور آئی ٹی اور الیکٹرانک میڈیا نے ایک حاوی مقام حاصل کر لیا ہے۔ اب تحریر کی بجائے تصور کا غلبہ ہے۔ کتاب اور تحریر کا علم اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ سچائی، سچ اور صداقت ایک حقیقت ہے جو انسانی عمل کی بنیاد بنتی ہے اور انسانی تہذیب و تمدن آج کل قانون کی شرطِ اول ہے لیکن اب نئی ٹیکنالوجی نے اس بنیاد کو ہلا دیا ہے۔ اب سچ اور صداقت کو فوٹو شاپ، ورکشاپ اور ملٹی میڈیا میں وضع کیا جا رہا ہے۔ سوشل میڈیا نے اس کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔ اکیسویں صدی کے اس عہد کو انسانی فکر کی تاریخ میں پوسٹ ٹروتھ یعنی پس صداقت کا عہد کیا گیا ہے۔ جب من گھڑت بہانے بنائے جاتے ہیں اور ان کو پھیلایا جاتا ہے اور ان کا اثر اس قدر ہے کہ سچائی کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ اقبال نے شاید اس عہد کا خواب نہ دیکھا تھا لیکن اس کے پیروکار اب اس میں مبتلا ہیں۔

علامہ اقبالؒ

نالہ ہے بُلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

پُختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمودۂ قاصد سے سُبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تو ہے زُنّاریِ بُت خانۂ ایام ابھی

عُذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی
ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات
تیری میزاں ہے شمارِ سحر و شام ابھی

ابرِ نیساں! یہ تنک بخشیِ شبنم کب تک؟
مرے کُہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

بادہ گردانِ عجم وہ، عربی میری شراب
مرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی

خبر اقبال کی لائی ہے گُلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

اقبال کی مذہبی رواداری

محمد یوسف وسیر/گوجرانوالہ

رواداری ایک کرداری اصطلاح ہے جس کی بنیاد سلوکیت پر ہے۔ متعدد شعبہ ہائے علوم کے لحاظ سے اس کا مفہوم قدرے مختلف فیہ ہے۔ بعض شعبہ ہائے زندگی میں اس کی حیثیت معروف اور مثبت رویے کے طور پر متعین کی جاتی ہے جب کہ بعض کے مطابق یہ مجہول اور منفی رویہ ہے۔ اسی طرح اس کے مدارج اور حدود کے تعین میں بھی اختلاف ہے۔

لسانی حوالے سے رواداری کا مفہوم ہے برداشت کرنا، جائز قرار دینا، تحمل کا مظاہرہ کرنا اور چشم پوشی کرنا۔ تمام کرداری خواص کی طرح رواداری بھی دو انتہاؤں کے درمیان اعتدال کا نام ہے۔ ایک انتہا بے جا رواداری ہے جس کا نتیجہ فساد کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے جب کہ دوسری انتہا صبر و تحمل کا دامن چھوڑ دینا ہے۔

تہذیبی بنیادوں پر رواداری سے مراد ہے کہ دیگر اقوام کی طرز ہائے زندگی کو اپنی قوم کی طرز زندگی سے کم تر نہ سمجھا جائے۔ دیگر اقوام کے رسوم و رواج، رہن سہن، روایات اور عقاید کو اسی تحسین کی نظر سے دیکھا جائے جیسی کہ اپنے عقائد کے بارے میں دوسروں سے توقع کی جاتی ہے۔

معاشرتی رواداری سے مراد ہے کہ ہم دیگر ارکان معاشرہ کی پسند اور ناپسند کو اتنی ہی اہمیت دیں جتنی کہ خود ہماری پسند اور ناپسند کی اہمیت ہے۔ دیگر افراد و اقوام سے متعلق ایسی گفت گو سے اجتناب کیا جائے جیسی گفت گو سننے کی برداشت خود ہم میں موجود نہیں۔ معاشرتی بنیادوں پر چند علامتیں ہیں جو کسی قوم، افراد کے گروہ یا فرد کے مذہبی طور پر متحمل مزاج ہونے کی غماز ہیں جیسا کہ دیگر افراد کو مذہب کی بجائے معاشرتی عوامل کی بنیاد پر پرکھنا، دیگر مذاہب کے افراد سے اخلاق اور محبت سے پیش آنا، دیگر مذاہب کے رسوم و رواجات کا احترام کرنا اور دیگر مذاہب کے بزرگان کا احترام کرنا۔

نفسیاتی بنیادوں پہ رواداری کا مفہوم قدرے مختلف ہے۔ نفسیاتی طور پر رواداری یہ ہے کہ ایک فرد اپنی جبلت، فطرت، عادت اور جذبے کے تحت جو ردعمل ظاہر کرنا چاہتا ہے اس پر قابو پاتے ہوئے اس ردعمل کو کا مظاہرہ کرنے یا ظاہر کرنے سے باز رہے۔

مذہبی رواداری سے مراد ہے کہ دیگر مذاہب کے پیرو کاروں کو اپنے عقائد کے مطابق زندگی گذارنے کا حق دیا جائے اور انہیں آزادی ہو کہ زمانی و مکانی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر اپنے مذہبی شعائر پر عمل پیرا ہو سکیں۔

اقبال کی پرورش ایک مذہبی ماحول میں ہوئی جس نے اقبال کے مزاج کو خالص مذہبی رنگ بخشا۔ شاعری کے ملکہ نے ان میں تحمل اور برداشت پیدا کر دی جب کہ فلسفے کے مطالعہ نے ان کے قلب و نظر کو وسعت عطا کی۔ ان عوامل نے آپ میں مذہبی رواداری کی کرداریت کو پروان چڑھایا۔ اقبال کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ان کا رویہ دیگر مذاہب کے لیے تعصب سے پاک تھا۔ لیکن یہاں ہم ان کی زندگی کی بجائے ان کے کلام کو مدنظر رکھتے ہوئے جائزہ لیں گے کہ آپ کس حد تک کس درجے تک اور کس نوعیت کی مذہبی رواداری کے قائل تھے۔

معاشرتی بنیادوں پر چند علامتیں ہیں جو کسی قوم، افراد کے گروہ یا افراد کے مذہبی طور پر متحمل مزاج ہونے کی غماز ہیں جیسے کہ دیگر افراد کو مذہب کی بجائے معاشرتی عوامل کی بنیاد پر پرکھنا، ان سے عمدہ اخلاق اور محبت سے پیش آنا، مذہب پر بات کرتے ہوئے دیگر مذاہب کے رسوم و رواجات کا احترام کرنا، اور دیگر مذاہب کے بانیان کو خراج تحسین پیش کرنا۔ اقبال کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ ان کا رویہ دیگر مذاہب سے متعلق تعصب سے پاک تھا۔ لیکن یہاں ہم اقبال کی زندگی کی بجائے ان کے کلام کو مدنظر رکھتے ہوئے جائزہ لیں گے کہ آپ کس حد تک، کس درجے تک اور کس نوعیت کی مذہبی آزادی کے قائل تھے۔

تمام مذاہب میں اپنے اپنے عقائد، عبادات، مذہبی تہوار اور رسوم و رواجات سے متعلق اصطلاحات کا ایک نظام پایا جاتا ہے۔ ان اصطلاحات کا اس خاص مذہب میں مخصوص مفہوم ہوتا ہے۔ اقبال نے اپنے کلام میں دیگر مذاہب کی اصطلاحات کو نہایت احترام کے ساتھ استعمال کیا ہے جو کہ ان کے مذہبی عدم تعصب کا ثبوت ہے۔ ان اصطلاحات کا استعمال براہ راست مفہوم میں بھی ہوا ہے اور تشبیہہ، استعارہ اور تلمیح کی صورت میں بھی نظر آتا ہے۔ جیسے کہ:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے تیرے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامان آسمان سے اس کا کلس ملادیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

مندرجہ بالا نظم میں ہندوازم کی اصطلاحات کا ادب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جیسا کہ تیرتھ، منتر، پجاری، شانتی، شکتی، بھگت، مکتی، مورتی وغیرہ۔ اوراس کے علاوہ اس نظم میں ہندواور مسلم مذہب کے پروکارو میں باہمی محبت کا درس بھی ہے۔

مذہبی رواداری کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ کسی بھی مذہب پر یقین نہ کیا جائے۔ اس درجہ کو دہریت یا لادینیت کا نام دیا جاتا ہے۔ بہت سے شعرااور فلاسفہ ان نظریات کے حامل ہیں جیسے کہ نطشے، سارتر اور کرکی گارڈ۔ اقبال کے کلام میں اس قسم کا خیالات کا شائبہ نہیں ہے۔

مذہبی عدم تعصب کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ انسان کسی نہ کسی مذہب کا پیرو کار تو ہولیکن اس نظریے کو ساتھ کہ تمام مذاہب بنیادی طور پر ایک ہی ہیں اور ایک ہی منزل کے راستے ہیں۔ اس نکتہ نظر کو صلح کل کا نام دیا جاتا ہے۔ مختلف مذاہب میں مصلحین اور متصوفین ان نظریات کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں۔ اقبال تصوف کے قائل ہونے کے باوجود اس نظریے کے قائل نظر نہیں آتے۔

مذاہب عالم کا مطالعہ ایک تعلیم یافتہ فرد کے لیے عمومی طور پر اور ایک فلسفے کے طالب علم کے لیے خصوصی طور پر ضروری ہے۔ اقبال نہ صرف یہ کہ مطالعہ مذاہب عالم کے قائل تھے بلکہ دیگر مذاہب کی تعلیمات کے اثرات کا بھی اعتراف کیا۔ آپ لکھتے ہیں:

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

تیسرا درجہ یہ ہے کہ تمام مذاہب بلحاظ مقصد اپنی اپنی جگہ درست ہیں، تمام مذاہب انسان کی بہتری کے لیے کوشاں ہیں اور انسان کی ذہنی آسودگی کے لیے عمل پیرا ہیں۔ مذہبی رجحان رکھنے والے زیادہ تر افراد اسی نظریے کے قائل ہوتے ہیں اور اقبال کی رواداری بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس مقام پر اقبال انسانیت اور کو ہی بالاتر مانتے ہیں اور مذہب کی بنیاد پر تعصب کو پسند نہیں کرتے۔ آپ لکھتے ہیں:

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

آپ مذہب کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں سچا اور حقیقی مذہبی وہی ہے جو دوسرے مذاہب کا احترام کرے اور مذہب کی بنیاد پر تعصب کی حوصلہ شکنی کرے۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

دیگر مذاہب کی طرف عدم تعصب کی ایک علامت یہ ہے کہ ان مذاہب کی خوبیوں کا ذکر کیا جائے۔ اگر مذاہب عالم کا مطالعہ کریں تو یہ امر واضح ہوتا ہے کہ چند ایک مذاہب جو کہ روائتی مذاہب کی ضد میں معرض وجود میں آئے ہیں اور خود کو شیطان کے پیرو کار کہتے ہیں کے علاوہ تمام مذاہب کا مطمح نظر فلاح انسانیت اور انجام بخیر کا ہے۔ یعنی ان کا طریقہ کار مختلف ہوسکتا ہے مقصد ایک ہی ہے۔ اس لحاظ سے تمام مذاہب میں ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جن کو سراہنا وسعت قلبی اور وسعت نظری کی علامت ہے۔

مکالمہ شیخ و برہمن

اقبال محولہ زیریں نظم میں برہمن کی زبانی ہندو ازم کی چند ایک خوبیاں بیان کرتے ہیں۔

چشم دانش طائر معنی ندید
ناخن فکرش بخوں آلودہ ماند
عقدہ بود و عدم نکشودہ ماند
آہ برلب شاہد حرمان او
چہرہ غماز دل حیراں او
رفت روزے نزد شیخ کاملے
آں کہ اندر سینہ پرورے دلے
گوش بر گفتار آں فرزانہ داد
برلب خود مہر خاموشی نہاد

ایک مسلم ایک ہندو سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

گفت شیخ اے طائف چرخ بلند
اندکے عہد وفا باخاک بند
تاشدی اوارہ ء صحرا ودشت
فکر بے باک تو از گردوں گذشت
بازمیں درساز اے گردوں نورد
درتلاش گوہر انجم مگرد
من نگویم ازبتاں بیزار شو
کافری شائستہ ء زنار شو
اے امانت دار تہذیب کہن
پشت پا بر مسلک آبا مزن
گرز جمعیت حیات ملت است
کفر ہم سرمایہ ء جمعیت است
تو کہ ہم درکافری کامل نہء
درخور طوف حریم دل نہء
ماندہ ایم از جادہء تسلیم دور
تو زآذر من زابراہیم دور
قیس ماسودائی محمل نشد
در جنون عاشقی کامل نشد
مرد چوں شمع خودی اندر وجود
ازخیال آسماں پیما وجود

ہندو مسلم کو یوں جواب دیتا ہے:

درصد فتنہ را بر خود کشادی
دو گامے رفتی واز پافتادی
برہمن از بتاں طاق خود آراست
تو قرآں راسر طاقے نہادی
برہمن را نگویم ہیچ کارہ
کند سنگ گراں را پارہ پارہ
نیاید جز بہ زور دست و بازو
خدائے را تراشیدن زخارہ
نگہ دارد برہمن کار خود را
نمی گوید بہ کس اسرار خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگزر
بدوش خود برد زنار خود را
برہمن گفت برخیز از درغیر
زیاران وطن ناید بہ جز خیر
بیک مسجد دو ملا می نہ گنجد
زافسوں بتاں گنجد بیک دیر

مذاہب کی ابتدا کا جائزہ لیا جائے تو ہندو مذہب کے علاوہ تقریباً تمام معروف مذاہب ایک فرد سے شروع ہوتے ہیں جنہیں بانیانِ مذاہب کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ تمام افراد اعلیٰ درجے کی خصوصیات کے حامل تھے اور ان کا احترام ہر ذی شعور فرد پر لازم ہے۔ اقبال کے کلام میں متعدد افراد کا ذکر ہے جو کہ کسی نہ کسی مذہب کے بانی ہیں۔ ذیل میں ان بزرگان کا ذکر اور اقبال کے کلام میں ان سے متعلق خیالات مندرج ہیں:

گرونانک

گرونانک ننکانہ صاحب میں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ ہندو کھتری ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ہندوازم کی چند فرسودہ رسومات کو ختم کرنے کے لیے اٹھے اور پھر نئے مذہب کی بنیاد رکھی جو سکھ ازم کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آپ نے مساوات، انسان دوستی، نیکی اور خیر کا پرچار کیا۔

اقبال نانک کا ذکر بطور مجدد کے کرتے ہیں اور آپ کا نام حضرت معین الدین چشتی اجمیری کا ساتھ کرتے ہیں:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

اقبال نے ایک نظم معنون بہ نانک بھی تخلیق کی ہے:

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروہ نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
آہ بدقسمت رہے آواز حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفے پر ناز تھا
شمع حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارش رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بے گانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفل اغیار میں
بت کدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نور ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

سدھارتھ گوتم

سدھارتھ گوتم، مہاتما بدھ، اور گوتم بدھا بدھ ازم مذہب کے بانی ہیں۔ آپ ۵۸۳ ق م میں کپل میں ایک راجہ خان دان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اچانک گھر بار کو چھوڑا اور مکتی کی تلاش میں نکل پڑے۔ آپ نے مایا جال سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے راہبانیت کو فروغ دیا اور آواگون کو ختم کرنے کے لیے مکتی کا راستہ اپنایا۔ آپ کی تعلیمات میں سے اہنسا (امن، عدم تشدد) کا نظریہ نمایاں ہے۔ اقبال نے متعدد مقامات پر آپ کا اور آپ کی تعلیمات کا ذکر کیا ہے۔ اقبال نے آپ کو گوہر یک دانہ اور شمع سے تشبیہ دی ہے:

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروہ نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفل اغیار میں

اس کے علاوہ طاسین گوتم کے عنوان سے آپ کی تعلیمات کو حوالے سے ایک نظم ہے:

مئے دیرینہ و معشوق جواں چیزے نیست
پیش صاحب نظراں حور جناں چیزے نیست
ہر چہ از محکم و پایندہ شناسی گزرد
کوہ و صحرا و بروبحر کراں چیزے نیست
دانش مغربیاں فلسفہ مشرقیاں
ہم بت خانہ و درطوف بتاں چیزے نیست
از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگزر
کہ تو ہستی و وجود و جہاں چیزے نیست
در طریقے کہ بنوک مژہ کاویدم من
منزل و قافلہ وریگ رواں چیزے نیست
بگزر از غیب کہ ایں وہم وگماں چیزے نیست
در جہاں بودن و رستن زجہاں چیزے نیست
آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عمل تست جناں چیزن نیست
راحت جاں طلبی؟ راحت جاں چیزے نیست
درغم ہم نفساں اشک رواں چیزے نیست

CamScanner

چشم مخمور و نگاہ غلط انداز و سرور
ہمہ خوب است و لے خوش تر ازاں چیزے نیست
حسن رخسارے دے ہست و دے دیگر نیست
حسن کردارو خیالات خوشاں چیزے نیست

زرتشت

آپ زرتشت ازم کے بانی ہیں۔ آپ کا سن پیدائش اور جائے پیدائش نامعلوم ہے لیکن اندازا آپ کہا جاتا ہے کہ آپ ایران کے مشرقی علاقے میں پندرہ سو قبل مسیح پیدا ہوئے۔ آپ ثنویت کے قائل تھے اور نیکی اور بدی کے مبداد و خداؤں کے مانتے تھے جن کے نام اہورہ مزدہ اور اہرمن تھے۔ اقبال کے کلام میں ایک نظم بہ عنوان طاسین زرتشت ملتی ہے جس میں ان تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے انہیں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔

طاسین زرتشت

نور دریا ے است ظلمت ساحلش
ہم چو من سیلے نزاد اندر دلش
امندر دم موج ہا ئے بے قرار
سیل را جز غارت ساحل چہ کار
نقش بے رنگے کہ اوراکس ندید
جز بخوں اہرمن نتواں کشید
خویشتن را وا نمودن زندگی است
ضرب خودرا آزمون زندگی است
از بلا ہا پختہ تر گردد خودی
تا خدا را پردہ در گردد خودی
مرد حق بیں جز بحق خود اندید
لاالہ می گفت و در خوں می تپید
عشق را در خوں تپیدن آبرو است
ارہ و چوب و رسن عیدین اوست
در رہ حق ہر چہ پیش آید نکوست
در رہ حق ہر چہ پیش آید نکوست
مرحبا نامہربانی ہائے دوست
جلوہ حق چشم من تنہا نخواست
حسن را بے انجمن دیدن خطاست
چیست خلوت؟ درد و سوز و آرزوست
انجمن دید است و خلوت جستجوست
عشق در خلوت کلیم اللہی است
چوں بجلوت می خرامد شاہی است
خلوت و جلوت کمال سوز و ساز
ہر دو حالات و مقامات نیاز
چیست آں؟ بگزشتن از دیر و کنشت
چیشت ایں تنہا نہ رفتن در بہشت
گرچہ اندر خلوت و جلوت خداست
خلوت آغاز است و جلوت انتہا ست
گفتہ پیغمبری درد سراست
عشق چوں کامل شود آدم گراست
راہ حق با کارواں رفتن خوش است
ہم چوں جاں اندر جہاں رفتن خوش است

مسیح (حضرت عیسیٰ)

مسیح، حضرت عیسی، کرائسٹ عیسائی مذہب کے بانی ہیں۔ اسلام میں بھی آپ کو ایک جلیل القدر پیغمبر کے طور پر مانا جاتا ہے۔ آپ کی تحسین کے طور پر اقبال کی نظم ملتی ہے جس کا عنوان آپ ہی نام پر ہے یعنی طاسین مسیح:

طاسین مسیح

پور مریم آں چراغ کائنات
نور او اندر جہات و بے جہات
از دم او رفتہ جاں آمد بتن
ازتو جاں را دخمہ می گردد بدن
آں چہ ما کردیم باناسوت او
ملت او کرد بالاہوت او
مرگ تو اہل جہاں را زندگی است
باش تا بینی کہ انجام تو چیست

مذاہب کی ابتدا تو عموما ایک فرد سے ہوتی ہے لیکن اس کی ترویج و ترقی میں متعدد افراد کی کاوشیں شامل ہوتی ہیں۔ ان افراد کو مصلحین اور مبلغین کہا جاتا ہے۔ اقبال کے کلام میں دیگر مذاہب کے اکابرین کا بھی ذکر موجود ہے جنہوں نے اپنے مذاہب کو پھیلانے، ترقی دینے اور دفاع کرنے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔

رام

شری رام چندر ہندوازم کے برگزیدہ اکابرین میں سے ایک ہیں۔ آپ کو تری مورتی کے ایک بھگوان وشنو کا ساتواں اوتار مانا جاتا ہے۔ آپ کے والد کوشالیہ راج دھانی کوسالہ کے راجہ تھے۔ آپ کی داستان ہندوازم کی متبرک کتاب رامائن میں بیان کی گئی ہے۔ آپ کے خان دان کے دیگر افراد بھی وہ ہندو مذہب کے معروف کردار ہیں اور آپ کی داستان حق و باطل کا معرکہ سمجھا جاتا ہے۔

اقبال نے اپنی شاعری میں ان کا ذکر مختلف مقامات پر احترام کے ساتھ کیا ہے اور آپ کی تعریف میں ایک نظم معنون بہ رام تحریر کی ہے۔

لبریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

اعجاز اس چراغ ہدائت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

سوامی رام تیرتھ

آپ ہندوازم کے معروف مصلحین اور مبلغین میں سے ایک تھے۔ آپ گوجرانوالہ کے ایک نواحی گاؤں مرالی والہ میں ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے، گورنمنٹ کالج لاہور سے ریاضی میں ماسٹر ڈگری حاصل کی اور ایف سی کالج لاہور میں ریاضی کے استاد کے طور پر ملازمت شروع کی۔ یہاں آپ کی ملاقات سوامی ویوک آنند سے ہوئی اور آپ ان سے متاثر ہوکر خود بھی سوامی کے طور پر زندگی بتانے کا تہیہ کر کے تبلیغ کو نکل کھڑے ہوئے۔ آپ ویدانت فلسفہ کے مبلغ تھے، ذات پات کے خلاف تھے اور تعلیم نسواں کے حق میں آواز بلند کرتے تھے۔ آپ نے دنیاوی لذات سے منہ موڑ کر مکمل طور پر سنیاس مارگ کے راستے پر زندگی گذاری۔

اقبال نے سوامی رام تیرتھ کا ذکر ایک عارف کے طور پر کیا ہے۔

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرہ بے تاب تو

وشوامتر

براہم رشی وشوامتر رگ وید کے مصنفین میں سے ایک ہین۔ آپ نے رگ وید کا منڈل تین اور گیاتری منتر لکھا ہے۔ پرانوں کے مطابق آپ ان چوبیس رشیوں میں سے ایک ہیں جو گیاتری منتر کا معنی جان پائے ہیں۔ آپ کوشالہ کے ایک راجہ تھے جن کو راج رشی کا لقب دیا گیا ہے اور رامائن میں آپ کا ذکر ہے۔ اقبال نے انہیں عارف ہندی کے نام سے یاد کیا ہے اور مولانا رومی کی معیت میں ان سے روحانی ملاقات کا حال بیان کیا ہے۔

عارف ہندی (وشوامتر)

ذات حق را نیست ایں عالم حجاب
غوطہ را حائل نگردد نقش آب
زادن اندر عالمے دیگرخوش است
تا شباب دیگرے آید بدست
حق ورائے مرگ و عین زندگی است
بندہ چوں میرد نمی داند کہ چیست
گرچہ مامرغان بے بال و پریم
از خدا درعلم مرگ افزوں تریم
وقت؟ شیرینی بزہر آمیختہ
رحمت عامے بقہر آمیختہ
خالی از قہرش بہ بینی شہر ودشت
رحمت او ایں کہ گوئی درگزشت
کافری مرگ است اے روشن نہاد
کے سزد بامردہ غازی را جہاد
مرد مومن زندہ و باخود بجنگ
برخود افتد ہم چو بر آہو پلنگ
کافر بیدار دل پیش صنم
بہ زدین دارے کہ خفت اندر حرم
چشم کورست ایں کہ بیند ناصواب
ہیچ گہ شب رانہ بیند آفتاب
صحبت گل دانہ را سازد درخت
آدمی از صحبت گل تیرہ بخت
دانہ ازگل می پذیرد پیچ و تاب
تاکند صید شعاع آفتاب
من بگل گفتم بگو اے سینہ چاک
چوں بگیری رنگ و بو از باد و خاک
گفت گل اے ہوش مند رفتہ ہوش
چوں پیامے گیری از برق خموش
جاں بہ تن مارا ز جذب این و آں

بھرتری ہری

بھرتری ہری قدیم ہندو راجہ تھے جو شاعر اور ماہر زبان دان تھے۔ آپ کا منطق اور لسانیات پر کام مستند اور متبرک سمجھا جاتا ہے۔ اقبال نے بطور شاعر اور دانش وران کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

آں نوا پرواز ہندی را نگر
شبنم از فیض نگاہ او گہر
نکتہ آرائے کہ نامش برتی است
فطرت او چوں سحاب اذری است
ازچمن جزغنچہ نورس نہ چید
نغمہ تو سوئے ما او را کشید
پادشاہے بانوائے ارج مند
ہم بہ فقر اندر مقام اوبلند
کار گاہ زندگی را محرم است
او جم است و شعر او جام جم است
ما بہ تعظیم ہنر برخاستیم
باز بادے صحبتے آراستیم
اے کہ گفتی نکتہ ہائے دل نواز
مشرق از گفتار تو دانائے راز
شعر راسوزاز کجا آید بگوئے
از خودی یا از خدا آید بگوئے
کس نداند درجہاں شاعر کجاست
پردہ او ازبم و زیر نواست
آں دل گرمے کہ دارد درکنار
پیش یزداں ہم نمی گیرد قرار
جان مارا لذت اندر جستجوست
شعر را سوز از مقام آرزوست
اے تو از تاک سخن مست مدام
گر ترا آید میسر ایں مقام
بادو بیتے درجہاں سنگ وخشت

می تواں بردن دل از حور بہشت
ہندیاں را دیدہ ام در پیچ و تاب
سر حق وقت است گوئی بے حجاب

ایں خدایان تنک مایہ زسنگ اند و زخشت
برترے ہست کہ دور است ز دیر و کنشت
سجدے بے ذوق عمل خشک و بجائے نرسد
زندگانی ہمہ کردار چہ زیبا و چہ زشت
فاش گویم بتو حرفے کہ نداند ہمہ کس
اے خوش آں بندہ کہ برلوح دل او ابنوشت
ایں جہانے کہ تو بینی اثر یزداں نیست
چرخہ از تست وہم آں رشتہ بردوک تو رشت
پیش آئین مکافات عمل سجدہ گزار
زاں کہ خیزد ز عمل دوزخ و اعراف و بہشت

اہرام مصر

اہرام مصر فرعونوں کے مقابر ہیں اور فن تعمیر کے شاہ کار کے طور پر انہیں دنیا کے عجوبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اہرام مصر سے متعلق اقبال لکھتے ہیں:

اس دشت جگر تاب کی خاموش فضائیں
فطرت نے فقط کے ٹیلے کیے تعمیر
اہرام کی عظمت سے نگوں سار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر
فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو
صیاد ہیں مردان ہنر مند کہ نخچیر

ابوالہول

ابوالہول ایک دیو مالائی کردار ہے جسے دیوتا کی حیثیت حاصل ہے۔ اسے سورج کا دیوتا مانا جاتا ہے۔ اس چہرہ انسانی جب کہ باقی جسم شیر کا ہے۔ غزہ، مصر میں خوفو کے اہرام کے قریب پیوستہ ہے اور دنیا کے قدیم ترین اور بلند ترین مجسموں میں سے ایک ہے۔ اقبال نے اسے قدیم دانش کا منبع قرار دیا ہے۔

خود ابوالہول نے یہ نکتہ سکھایا مجھ کو
وہ ابوالہول کہ ہے صاحب اسرار قدیم
دفعتہً جس سے بدل جاتی ہے تقدیر امم
ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقل حکیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی
کبھی شمشیر محمد ہے کبھی چوب کلیم

مذہبی لحاظ سے تشدد اور تعصب کی ایک علامت یہ ہے کہ دیگر مذاہب کے مشاہیر جن کا تعلق چاہے زندگی کے کسی بھی شعبے سے ہو ان کی خدمات اور خوبیوں کو تسلیم نہ کیا جائے۔ جیسا کہ متعصب مغربی محققین مسلمان سائنس دانوں کی خدمات یا تو نظر انداز کر دیتے ہیں یا پھر انہیں کسی دیگر غیر مسلم سائنس دانوں سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اقبال نے دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے ایسے افراد جنہوں نے انسانیت کی فلاح کے لیے کردار ادا کیا ہے ان کا ذکر نہایت احترام سے کیا ہے اور انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

نپولین

نپولین بوناپارٹ فرانس کے ایک جزیرے کورسیکا میں ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ انسانی تاریخ کے معروف ترین سپاہ سالار اور متنازع ترین سیاسی راہ نماؤں میں سے ایک ہیں۔ آپ ۱۸۰۴ء سے فرانس کے شہنشاہ رہے۔ آپ نے اٹلی کی صدارت کی کرسی پر بھی قبضہ جمائے رکھا۔ آپ کی ترقی میں فرانس کے انقلاب کا بہت کردار ہے۔ اقبال نے نپولین کے مزار پر کے عنوان سے ایک نظم میں آپ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

راز ہے راز ہے تقدیر جہاں تگ و تاز
جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوش کردار سے شمشیر سکندر کا طلوع
کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوش کردار سے تیمور کا سیل ہمہ گیر
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صف جنگاہ میں مردان خدا کی تکبیر
جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر فرصت کردار نفس یا دو نفس
عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز
عاقبت منزل ما وادی خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

مسولینی

مسولینی ۱۸۸۳ء میں اٹلی میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک سیاست دان اور صحافی تھے۔ آپ نے فاشسٹ پارٹی کے بانی اور سربراہ تھے۔ آپ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۳ء تک اٹلی کے وزیر اعظم رہے۔ آپ پہلے اشتراکی نظریات کے حامی تھے اور یہ نظریات فسطائیت میں تبدیل ہو گئے۔

اقبال نے ان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے دو نظمیں تحریر کی ہیں۔

ندرت فکر و عمل کیا شے ہے ذوق انقلاب
ندرت فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب
ندرت فکر و عمل س معجزات زندگی
ندرت فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب
رومۃ الکبری دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر
این کہ بینم یہ بیداریست یارب یا نہ خواب
چشم پیران کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں تیرے ہیں سوز آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت یہ تمنا یہ نمود
فصل گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیر حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے

CamScanner

وہ کہ ہے جس کی نگہ مثل شعاع آفتاب
کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومان یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راج دھانی ہے مگر باقی نہ راجا ہے نہ راج
آل سیزر چوب نے کی آب یاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشت دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج
پردہ تہذیب میں غارت گری آدم کشی
کل روا رکھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

حکیم نطشہ

نطشے ۱۸۴۴ء میں جرمنی میں پیدا ہوئے۔ آپ ماہر لسانیات تھے اور پھر آپ نے فلاسفی کا مطالعہ شروع کیا اور یونی ورسٹی میں کلاسیکی فلسفہ کے استاد کی کرسی پر بیٹھنے والے سب سے کم عمر شخص کے طور پر سامنے آئے۔ آپ لادینیت کے قائل تھے۔ آپ کا فلسفہ تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کے چند نظریات انہیں کے نظریات سے ماخوذ سمجھے جاتے ہیں۔ اقبال نے انہیں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے دو نظمیں لکھی ہیں۔ ان نظموں کا علاوہ بہت سے مقامات پر آپ کا اور آپ کے نظریات کا ذکر ہے۔

حریف نکتہ توحید ہو سکا نہ حکیم
نگاہ چاہیے اسرار لاالہ کے لیے
خدنگ سینہ گردوں ہے اس کا فکر بلند
کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لیے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی
ترس رہی ہے مگر لذت گناہ کے لیے

مقام حکیم نطشے

من بہ رومی گفتم ایں دیوانہ کیست
گفت ایں فرزانہ المانوی است
درمیان ایں دو عالم جائے اوست
نغمہ دیرینہ اندر نائے اوست
باز ایں حلاج بے دار و رسن
نوع دیگر گفتہ آں حرف کہن
حرف او بے باک و افکارش عظیم
غربیاں از تیغ گفتارش دونیم
ہم نشیں بر جذبہ او پے نبرد
بندہ مجذوب را مجنوں شمرد
عاقلاں از عشق و مستی بے نصیب
نبض او دادند در دست طبیب
با پزشکاں چیست غیر از ریو و رنگ
وائے مجذوبے کہ زاد اندر فرنگ
ابن سینا بر بیاضے دل نہد
رگ زند یا حب خواب آور دہد
بود حلاجے بشہر خود غریب
جاں ز ملا برد و کشت او را طبیب
مرد رہ دانے نبود اندر فرنگ
پس فزوں شد نغمہ اش از تار چنگ
راہرو را کس عیار او را نکرد
کاردانے مردکار او را نکرد
عاشقے در آہ خود گم گشتہ
سالکے در راہ خود گم گشتہ
مستی او ہر زجاجے را شکست
از خدا ببرد و ہم از خود گسست
خواست تا بیند بچشم ظاہری
اختلاط قاہری با دلبری
خواست تا از آب و گل آید بروں
خوشہ کز کشت دل آید بروں
آں چہ او جوید مقام کبریاست
ایں مقام از عقل و حکمت ماوراست
زندگی شرح اشارات خودی است
لاو الا از مقامات خودی است
او بہ لا درماند و تا الا نرفت
از مقام عبدہ بے گانہ رفت
با تجلی ہم کنار و بے خبر
دور تر چوں میوہ از بیخ شجر
چشم او جز رویت آدم نخواست
نعرے بے باکانہ زد آدم کجاست
ورنہ او از خاکیاں بیزار بود
مثل موسی طالب دیدار بود
کاش بودے در زمان احمدے
تا رسیدے بر سرورے سرمدے
عقل او با خویشتن در گفت گوست
تو رہ خود رو کہ راہ خود نکوست
پیش نہ گامے کہ آمد از مقام
کاندرو بے حرف می روید کلام

ان کے علاوہ اقبال نے سائنس، دفاع، معاشیات، عمرانیات وغیرہ کے شعبہ ہا سے متعلق غیر مسلم مشاہیر کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے اور ان کی تعلیمات کو سراہا ہے۔ ان تمام کا مفصل ذکر طوالت کا باعث ہوگا لہذا ہم نے ان مشاہیر کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق براہ راست مذہب اور فلسفہ سے ہے۔

مندرجہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اقبال ایک راسخ العقیدہ مسلم تھے، اسلامی شعائر پر یقین کامل رکھتے تھے مگر مذہب کی بنا پر نفرت کے قائل نہیں تھے۔ مذہب کے نام پر تشدد اور ظلم کو روا نہیں سمجھتے تھے اور دیگر اقوام و افراد کے ساتھ مذہبی بنیادوں کی بجائے انسانیت کی بنیاد پر تعلقات وابستہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

CamScanner

غالب جوایک شاعر تھا عالم میں انتخاب

امجد محمود چشتی/میاں چنوں

دنیا میں سخن وروں کی کمی نہیں لیکن غالب کا اندازِ بیاں واقعی اور ہے۔کہیں نہ کہیں سب مغلوب ہوئے مگر غالب ہر جگہ،غالب ہی ہے۔شاعری فقط قافیہ پیمائی اور لفاظی کا نام نہیں بلکہ ایک بڑا شاعر ایک ہی وقت میں دانشور،عیب جُو،مورخ،حاذق،سیاستدان، عالم،فلسفی،طنز کار،مصلح اور صوفی بھی ہوتا ہے۔اقبال جوانوں کو متاثر کرتا ہے جبکہ غالب ادھیڑ عمروں کا شاعر ہے اور جوانوں کے واسطے چچا غالب ہے۔ماں باپ غالب کے بچپن میں ہی گزر گئے تو ماموں کے ہاں رہے۔محرومیوں اور دکھوں نے دل میں گھر کیے رکھا مگر زندگی رئیسانہ انداز میں گزاری۔کبھی عیش ولذت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ماموں نے سدھار کی خاطر بالی عمر یہ میں ہی شادی کروادی مگر غالب اور سدھار؟ ناممکن۔غالب مانتے تھے کہ وہ سور نہ کھانے کے باعث آدھا مسلم اور مئے خوری کی وجہ سے آدھا کافر ہے،اسی لیے کعبے کو جاتے ہوئے غالب شدید شرم محسوس کرتے تھے ۔ زندگی کرب میں بیت گئی۔آگرہ سے نکلے،دہلی میں کبھی جیل کبھی غدر،کلکتہ پہنچے تو چین نہیں،لکھنو ویسے پسند نہ آیا،بنارس بھلا لگا لیکن وہاں رہنا دشوار ہوا۔تاہم بنارس کی شان میں ،،چراغِ دہر،،ضرور لکھ دیا۔غریبی میں لذت کی خُو نہ چھوڑی اور قرض کی مئے سے فاقہ مستیوں میں رنگ بھرے۔قرض لیکر بھی سکاٹ لینڈ کی شراب پی او. دیسی کو منہ تک نہ لائے۔بلا کے خوددار تھے،جامِ جم سے اپنا جام سفال اچھا گردانتے رہے۔حتیٰ کہ خدا کو بھی باور کرادیا کہ ''الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا'' مگر حالات سے مجبور ہو کر پیسوں کی خاطر قصیدے بھی لکھنا پڑے۔خود اعتراف کرتے ہیں:

غالب وظیفہ خوار ہو دو،شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

قرض کے حصول کے لیے نا چاہتے ہوئے خوشامد بھی کرنی پڑی۔وبائیں اور دنگے تو ہر لمحہ ان کے ساتھ رہے۔عاشق مزاج ہونے کے باوجود سب کے معشوق تھے۔صرف ایک ڈومنی پر دل آیا مگر شومئی قسمت کہ وہ بھی مر گئی ۔نامساعد حالات اور کسمپرسی میں ،،ابنِ مریم ہوا کرے کوئی ،، کی حسرت بھی پالی۔غالباً ان کے مُخاطَب انگریز تھے۔مسائل بڑھے تو کاموں کا آساں ہونا اور آدمی کو انسان ہونا میسر نہ رہا۔غالب کے گھر کئی بچے ہوئے مگر سب بچپن میں ہی جنت مکانی ٹھہرے۔بھانجے زین العابدین کو گود لیا تو وہ بھی اٹھارہ برس میں چل بسا۔پوری زندگی میں بس اسی وقت ایک مرثیہ لکھا،

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

مرقومہ بالا مصائب میں جوانمردی سے قیام کیا اور ایک بہت بڑی حقیقت بھی تسلیم کرتے گئے،کہ

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جُز مرگ علاج؟
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالب اتنے غموں سے خُوگر ہوئے،اتنی مشکلیں پڑیں کہ مشکلیں خود آسان ہونے لگیں۔کوئی بھی مشکل ان کے پروازِ تخیل کی معراج میں حائل نہ ہو سکی۔غالب کا اک نرالا اسلوب ہے کہ وہ ہر بات میں ''آپشن'' ڈھونڈتے ہیں جیسے ،اگر ایسا ہوتا تو کیا ہوتا،ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔اور ڈبویا مجھ کو ہونے نے نا ہوتا میں تو کیا ہوتا؟ شاید اس لیے کہ غالب کا ہندوستان آزاد ہندوستان نہیں ہے۔انھیں مخمصہ ہے کہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو مانیں یا وائسرائے کو؟ ۔،،خاک میں کیا صورتیں تھیں جو کہ پنہاں ہو گئیں،،والے مصرعے میں تو انھیں بہت دور کی سوجھی ہے۔عام مفہوم کے علاوہ کچھ ذاتی مشاہدات بھی ہو سکتے ہیں۔مثلاً کتنے کفر سپردِ قرطاس کیے ہوں اور مُلاں کے خوف سے پھاڑ دیئے ہوں ،کتنے عشق رچائے ہوں اور بخوفِ رسوائی ترک کر دیئے ہوں۔یا پھر شاعری میں کچھ لکھا اور خود تنقیص کر کے نکال پھینکا ہو۔صرف چج کی چیز رہنے دی اور خرافات نذرِ آتش کیں ہوں ۔اسی لیے تو ان کا ایک شعر بھی ایسا نہیں جسے عام کہا جا سکے۔مئے خواری غالب کی زندگی کا جزوِ لاینفک ہے۔،،تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ باہ خوار ہوتا،،کی آڑ میں غالب آدمی کے کردار ناپنے کے معیار پر طنز کرتا ہے کہ کیسے ایک خامی ہزاروں خوبیوں پر بھاری پڑ جاتی ہے۔وہ ثوابِ طاعت وزُہد کے قائل تو ہیں پر طبیعت کی اس جانب عدم توجہی کے بھی کھلے بندوں معترف ہیں۔غالب رئیس فقیر تھے اور غربت میں بھی چار چار نوکر رکھے ہوئے تھے ۔گوشت شراب کا کوئی ناغہ نہیں۔پھوڑے نکل آئے پر آم نہ چھوڑے۔غریبی سے بھی محظوظ ہوتے ہیں اور بھیس بدل کر تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کے شائق ہیں۔نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا،،لکھ کر انسانی تاریخ کے کئی پہلوؤں کو دلکش اسلوب سے سامنے لاتے ہیں۔شاہانِ ایران کی تلمیح کہ دربار میں فریاد کرنے والا کاغذ کا لباس پہن کر شاہ کے حضور پیش ہوتا تھا اور اسی لباس پر فیصلے لکھے جاتے

تھے۔ دوسرا یہ کہ دنیا میں آنے والے ہر انسان کا مقدر لکھ دیا جاتا ہے۔ گویا کاغذی پیرہن لوح ہے جو قسمت کے فیصلوں کے لکھے جانے کی منتظر ہے۔ ہر انسان لاچار و مجبور ہے۔ مگر ساتھ ہی عمومی رجحان کے پیش نظر انجانا سا خوف بھی ہے۔ کہتے ہیں،

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ایک طنز بھی ہے کہ کون اس طرح کے ظلم روا رکھے ہوئے ہے؟۔ غالب رازداری کا حامی بھی ہے کہ کہیں ہولناک حقیقت مایوس ہی نہ کر دے۔ مثلاً

خدا کے واسطے کعبے سے پردہ نہ ہٹا ظالم
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

خودی و خودداری کے باوجود حقیقت پسندی ایسی کہتے تھے

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

گویا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ سب کی طرح غالب نے بھی مرجانا ہے، لہٰذا اسے مرنے تک جینے کی مہلت دے دو یار۔ غالب پر غالب ہونے کے باوجود انکساری کا عنصر بھی موجود موجود تھا۔ انھوں نے عظمتِ مشاہیر کی بابت کھلے دل سے لکھا کہ

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ایک اور جگہ تسلیم کرتے ہیں کہ:

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسداللہ خاں قیامت ہے

غالب کو پڑھ کر بس یہی سوچ جا رہا ہوں کہ غالب کو،، خدائے سخن،، کیوں نہ کہا گیا۔ کوئی جانے تو ضرور بتائیے گا۔

نعتِ رسول ﷺ

لکھی مرے قلم نے مودّت حضورؐ کی
مجھ پر بڑا کرم ہے، عنایت حضورؐ کی
یہ کائنات جتنی بھی وسعت پذیر ہو!
"پھیلی ہے کائنات میں رحمت حضورؐ کی"
میرا قلم، کہ وقف ہے اِس ذکر کے لیے
میرا کرم، نصیب ہے مدحت حضور کی
ہر گام پر نہ یوں ہو مسائل کا سامنا
اُمت اگر نہ چھوڑے اطاعت حضور کی
موجود ہوتا عہدِ رسالت مآبؐ میں
کرتا میں ساری عمر ہی خدمت حضورؐ کی
انؐ کا کرم، بچے ہیں جہنّم کی آگ سے
بس کام کر گئی ہے شفاعت حضور کی
دنیا پہ حکمرانی کسی اَور کی سہی!
ہے آج بھی دلوں پہ حکومت حضور کی
گزری ہے عمر اپنی جو اتنے سکون سے
ہر گام رہنما رہی سیرت حضورؐ کی
اَسرارِ کائنات سبھی دسترس میں تھے
منظر جو دیکھتی تھی بصیرت حضورؐ کی
اپنا حوالہ اور نسیمِ سحر ہے کیا؟
نسبت حضورؐ کی ہے، اِرادت حضورؐ کی

نسیمِ سحر/راول پنڈی

غزل

جب بھی کوئی نیا زخم کھایا کرو، مسکرایا کرو
حوصلے دل کے یوں آزمایا کرو، مسکرایا کرو
جو ستم ہو، اُسے بھول جایا کرو، مسکرایا کرو
یوں نہ آنسو بہر دم بہایا کرو، مسکرایا کرو
یوں نہ رویا کرو، دُکھ چھپایا کرو، مسکرایا کرو
ساتھ مت دوسروں کو رُلایا کرو، مسکرایا کرو
جو جُدا ہو گیا مل نہ پائے گا اب، بھول جاؤ اُسے
روز اِک درد مت ڈھونڈ لایا کرو، مسکرایا کرو
اپنے اندر ہی گھٹ کر نہ مر جاؤ تُم موت سے پیشتر!
دُکھ جو لاحق ہیں کچھ تو بتایا کرو، مسکرایا کرو
اُس کے غم کو مسلّط نہ دل پر کرو، گھر سے نکلو کہیں
دوستوں میں کبھی آیا جایا کرو، مسکرایا کرو
کربِ تخلیق کی یوں نہ تجدید کرتے رہو رات بھر
شعر اپنے نہ خود کو سُنایا کرو، مسکرایا کرو!
وُہ بچھڑ بھی گیا تو قیامت نہیں آ گئی ہے کوئی!
یوں قیامت نہ اتنی اُٹھایا کرو، مسکرایا کرو
قید اپنے بدن کے قفس کی ابھی ختم ہو گی کہاں؟
یوں نہ تُم اپنے پَر پھڑ پھڑایا کرو، مسکرایا کرو
عین ممکن ہے دھبے مرے خون کے یوں ہی مدھم پڑیں!
روز ہاتھوں پہ مہندی رچایا کرو، مسکرایا کرو
گھر کی تنہائی میں چھپ کے روتے رہو تم نسیمِ سحر
اُس گلی میں مگر جب بھی جایا کرو، مسکرایا کرو

نسیمِ سحر

اسلاف کی روایت کے امین جسٹس (ر) میاں نذیر اختر

حسن عباسی/لاہور

زندگی کی راہوں میں کچھ ملاقاتیں ایسی ہوتی ہیں جو نہ صرف دل کے دریچوں کو وا کرتی ہیں بلکہ فکر ونظر کے نئے جہانوں سے بھی روشناس کرواتی ہیں۔ ایسی ہی ایک ملاقات، جو میرے حافظے کے افق پر ہمیشہ چمکتی رہے گی، وہ ہے محترم جناب جسٹس (ر) میاں نذیر اختر صاحب سے۔ اس روح پرور ملاقات کا شرف مجھے کسی اور کے وسیلے سے نہیں، بلکہ میرے مہربان اور قدردان دوست، معروف ادیب و مفکّر جناب جمیل یوسف کی وساطت سے حاصل ہوا۔ جمیل یوسف نہ صرف ممتاز ادیب ہیں بلکہ ان کی رفاقت میرے لیے نایاب اثاثہ ہے۔ یہ ان کی ہی عنایت تھی کہ میں ایک ایسی شخصیت سے متعارف ہوا جن کے علم، حلم، فہم اور دین فہمی نے مجھے گہرے اثرات میں لے لیا۔

مجھے آج بھی وہ لمحہ بخوبی یاد ہے جب جناب جمیل یوسف کی رفاقت میں محترم جسٹس (ر) میاں نذیر اختر صاحب میرے دفتر، نستعلیق پبلی کیشنز اردو بازار لاہور تشریف لائے تھے۔ جیسے ہی وہ دروازے سے اندر داخل ہوئے، ایک روحانی سی روشنی نے ماحول کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ان کا نورانی چہرہ اور بارعب شخصیت پہلی ہی نظر میں دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

ان کی آمد محض ایک ملاقات نہ تھی، بلکہ ایک ایسی ساعتِ سعید تھی جو قلب ونظر کو جلا بخشنے والی ثابت ہوئی۔

جب کلام کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کی گفتگو میں علم کی وہ وسعت تھی جو صرف کتابوں میں نہیں، بلکہ تجربات، بصیرت اور تقویٰ کی گہرائیوں سے جنم لیتی ہے۔

پہلی ہی نشست میں ان کی جاذبِ نظر شخصیت نے میرے دل پر ایسا نقش چھوڑا، جو وقت کے ہر لمحے میں اور بھی روشن ہوتا چلا گیا۔

وہ میرے دفتر کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں تشریف لائے تھے، مگر یہ ایک معمولی ملاقات نہ تھی۔ یہی ایک لمحہ تھا جس نے ایک روحانی اور قلبی وابستگی کا دروازہ وا کر دیا۔ اس ملاقات نے ایک ایسا تعلق جنم دیا جو وقت کے ساتھ محض رسمی نہ رہا، بلکہ خلوص، شفقت اور روحانی کشش کا روپ دھار گیا۔

یوں ان سے ملاقاتوں کا ایک حسین سلسلہ چل نکلا، اور ان کی شفقت بھری دعوت پر میں نے ان کے دولت کدے پر حاضری دینا شروع کی۔ اگرچہ ابتدا میں یہ ملاقاتیں محض کتاب کی اشاعت سے متعلق تھیں، لیکن جلد ہی ان کی شفقت ومحبّت اور درویشانہ مزاج نے مجھے اپنی روحانی فضا میں اس طرح جکڑ لیا کہ میں خود کو ان کے سحر سے نکال نہ سکا۔

ان کے گھر کا ماحول گویا ایک روح کی بستی ہے، جہاں ذکرِ الٰہی کی مہک، ادب واحترام کی خوشبو، اور دینی فضا کی تازگی ہر لمحہ محسوس ہوتی ہے۔ وہاں جا کر مجھے یوں لگا جیسے میری روح کی پیاس کو ایک چشمۂ سیرابی میسر آ گیا ہو۔

ان کا حلقۂ احباب بھی کچھ کم نہ تھا؛ وہ لوگ جن کی صحبت میں بیٹھنا دل کو روشنی عطا کرتا، جن کی گفتگو حمد ونعت کی خوشبو سے مہک رہی ہوتی۔ اکثر محفلیں ایسی ہوتیں جن میں عشقِ الٰہی اور محبتِ رسولؐ کی لَے بلند ہوتی اور دل سکون کے ایک ایسے سمندر میں ڈوب جاتا جہاں سے واپسی ممکن نہ ہوتی اور شاید مطلوب بھی نہ تھی

جسٹس صاحب کے ہاں مہمان نوازی صرف ایک رسم یا روایت نہیں، بلکہ ایک روحانی وقلبی جذبے کا نام ہے۔ ان کے گھر کا ماحول، ان کی تربیت اور مہمان کے لیے اظہارِ محبت کے طریقے اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ محض ایک صاحبِ علم ہی نہیں بلکہ صاحبِ دل بھی ہیں۔

ان کے ہاں جب بھی کوئی مہمان آتا ہے تو استقبال کا انداز ہی روح کو تازگی بخشتا ہے۔ ان کی دیرینہ روایت ہے کہ مہمان کے لیے سب سے پہلے آبِ زمزم اور اعلیٰ معیار کی مدنی، بالخصوص عجوہ کھجوریں پیش کی جاتی ہیں، یہ عمل نہ صرف سنّتِ نبوی کا عکس ہے بلکہ مہمان کے لیے عزت واحترام کا حسین پیغام بھی ہے۔ اس کے بعد جو بھی ضیافت پیش کی جاتی ہے، اس میں خوش ذوقی، ذاتی دلچسپی اور سلیقے کا رنگ نمایاں ہوتا ہے جو ان کی مہمان نوازی کی روایت کو زبانِ حال سے بیان کرتا ہے۔

ان کا اندازِ گفتگو نہایت شائستہ، نپا تلا اور شگفتہ ہوتا ہے۔ دینی معاملات ہوں یا دنیاوی موضوعات، وہ ہمیشہ دلیل سے بات کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں نہ کوئی شدت پسندی ہوتی ہے اور نہ ہی اجارہ داری کا رویّہ۔ دوسروں کو کُھلے دل سے اپنی بات کہنے کا موقع دیتے ہیں، اور اگر سامنے والا نکتہ درست ہو تو اس کو تسلیم کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ یہی وصف ان کی علمی دیانت کا مظہر ہے، جو آج کے دور میں ایک نایاب خوبی بن چکی ہے۔

کتنی ہی سنجیدہ محفل ہو، جسٹس صاحب کی گفتگو میں ایسی لطافت چھپی ہوتی ہے کہ موقع کی مناسبت سے کوئی برجستہ بات کر کے محفل کو کشتِ زعفران بنا

دیتے ہیں۔ یا پھر کوئی خوبصورت شعر سنا کر ایسا رنگ جما دیتے ہیں کہ سننے والے بے ساختہ داد دیے بغیر نہیں رہتے۔ ان کی حسِ ظرافت، ان کے فہم و فراست سے الگ نہیں، بلکہ اس کا تسلسل محسوس ہوتی ہے۔

میں ایک بار بہاولپور جا رہا تھا ان کا فون آیا غالباً بلانا چاہتے تھے، میں نے انہیں بتایا کہ میں بہاول پور جا رہا ہوں اور بس میں ہوں، انہوں نے بے ساختہ کہا اس کا مطلب ہے آپ ہمیں بے بس کر کے جا رہے ہیں۔ اس طرح کے بے ساختہ شگفتہ جملے ان کے لبوں پہ آنے کو مچلتے رہتے ہیں۔ مجھے بہت سے اشعار یاد ہیں جنہیں موقع محل کی نسبت سے میں سناتا رہتا ہوں۔ آپ کی محفل میں جب بھی میں نے کوئی شعر سنایا آپ نے ہمیشہ اس مضمون کا اپنا یا کسی استاد شاعر کا شعر سنا کر محفل گرما دی۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ ان کی زندگی کا کثیر سرمایہ دینی معاملات اور فرائض کی ادائیگی میں خرچ ہوا۔ ادبی محافل سے دور رہے تو اتنے اشعار انہیں کیسے یاد ہیں یہ شاعری کے ساتھ ان کی گہری وابستگی ہے یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ وہ مثبت، تعمیری اور انقلابی شاعری پسند کرتے ہیں

شاید یہی وہ عوامل تھے جنہوں نے مجھے ان کی محفل کا رسیا بنا دیا۔ ورنہ میرے جیسے شخص کے لیے روایتی مولویوں کی صحبت، جو ہر وقت پند و نصائح کی تکرار اور دنیا کو گناہوں کی آماجگاہ قرار دینے میں مصروف رہتے ہیں، ایک گھٹن زدہ ماحول کی مانند ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کی گفتگو میں نہ توازن ہوتا ہے نہ زندگی کی وسعت، اور نہ ہی دل کو چھو جانے والی وہ حرارت جو ایک زندہ دل مصلح اور دانا انسان کی باتوں میں ہوا کرتی ہے۔

جسٹس صاحب کی محفل میں بیٹھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے علم، محبت، برداشت اور جمالیات کا ایک حسین امتزاج ہو۔ ایک ایسی بزم جہاں روح کو تازگی، دل کو قرار، اور فکر کو وسعت ملتی ہے۔

میں نے پچیس برس تک ایک ہنگامہ خیز ادبی زندگی کے مد و جزر میں وقت گزارا، ایک ایسا دور جس میں ملک ہو یا بیرون ملک، شب و روز مشاعروں کی رونقیں، شعری محفلوں کا شور، اور شعرا کے انداز و اطوار کا قریب سے مشاہدہ میرا معمول رہا۔

لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، اس دنیا کی رنگینیوں کے پیچھے چھپے مصنوعی پن اور رویوں کی منافقت نے میری روح کو تھکا دیا۔ جس خلوص کی تلاش میں شعر کہے، وہ کہیں نظر نہ آیا۔ یہ وہ وقت تھا جب میں نے آہستہ آہستہ اس شور سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور تنہائی و خاموشی کو اپنا بہترین رفیق بنا لیا۔

انہی لمحاتِ تنہائی میں میرے دو حمدیہ مجموعے منظرِ عام پر آئے، مگر میری روح کو وہ قرار نصیب نہ ہو سکا جس کی تلاش نے مجھے ادب کی راہوں پر لگایا تھا۔

پھر ایک ایسا وقت آیا جب محترم جناب میاں نذیر اختر صاحب کی صحبت نصیب ہوئی، یہ وہ صحبت تھی جس میں علم کی روشنی بھی تھی، روح کی غذا بھی، اور شعور کا سکون بھی۔

ان کی مجلس میں بیٹھنا ایک ایسی کیفیت عطا کرتا جو اندر کے خلا کو پُر کرنے لگی۔ وہ خود بھی ایک باکمال نظم اور غزل گو شاعر ہیں، لیکن جس شان سے وہ نعت کہتے ہیں، وہ ان کے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مظہر ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری صرف فن نہیں، عبادت ہے، اظہارِ عشق ہے، اور دل کی سچائی کا عکس ہے۔

یوں ہوتا کہ جب بھی میں ان سے ملنے جاتا تو راستے میں چلتے ہوئے دل میں نعت کے اشعار اترنے لگتے۔ یہ کیفیت کسی نظم کی تلاش کا نتیجہ نہ تھی بلکہ ایک وجدانی بہاؤ تھا جو ان کی صحبت کے تصور سے بیدار ہوتا۔ اکثر ایسا ہوا کہ جب میں ان کے گھر پہنچا، تب تک نعت مکمل ہو چکی ہوتی، گویا ان کی روحانی فضا اور شخصیت ہی میرے لیے الہام کا سرچشمہ بن گئی۔

جسٹس صاحب کا گھر ایک عام رہائش گاہ نہیں بلکہ ایک علمی، فکری اور روحانی مرکز ہے جہاں داخل ہوتے ہی کتابوں کی خوشبو، تہذیب کی مہک، اور محبت کی روشنی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے وسیع مطالعے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاں موجود کتب کا ذخیرہ کسی منظم لائبریری سے کم نہیں۔ دینی، ادبی، تاریخی اور فکری موضوعات پر نایاب و بیش قیمت کتابیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ علم ان کے مزاج کا جزوِ لازم ہے۔

گھر کے تہہ خانے میں ایک خوبصورت، باوقار اور پرسکون مسجد واقع ہے، جو نہ صرف عبادت کا مرکز ہے بلکہ روحانیت کا سرچشمہ بھی۔ اس میں گزشتہ 24 برس سے باجماعت نمازِ تراویح ادا کی جا رہی ہے۔ اسی روحانی ماحول میں وقتاً فوقتاً میلاد، نعتیہ محافل، اور اسلامی موضوعات پر علمی نشستوں کا اہتمام کیا جاتا ہے، جہاں شرکت کرنا کسی قلبی سکون اور روحانی تطہیر سے کم نہیں ہوتا۔

یہی وہ روحانی اثر اور فکری بالیدگی تھی جو ہمیں اس بات پر آمادہ کرتی چلی گئی کہ ہم جسٹس صاحب کی سرپرستی میں ایک ادبی بزم تشکیل دیں۔ چنانچہ ہم نے اُن کے زیرِ نگرانی "بزمِ کیفِ سخن" کے نام سے ایک ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی یہ نام بھی ان کا تجویز کردہ ہے۔ کئی یادگار مشاعرے منعقد کیے۔

ہر مشاعرے میں دو واضح حصے ہوتے: پہلا دور حمد و نعت کے لیے مخصوص ہوتا اور دوسرا نظم و غزل کے لیے۔ یہ تقسیم اس بات کی دلیل تھی کہ ادب میں روحانیت کو مقدم رکھا جائے، اور اظہار کو عبادت کا رنگ دیا جائے۔

جسٹس صاحب کی شخصیت میں ایک خوشگوار توازن ہے۔ اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق وہ ظاہری نمود و نمائش سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ بطور میزبان، خود کو مرکزِ محفل بنانے کے بجائے، شعرا و حاضرین کہ سننے کی طرف توجہ دیتے ہیں۔

مشاعرے میں ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ شعرا کی تعداد محدود ہو تا کہ ہر شاعر کو مکمل موقع ملے، اور سننے والے ہر شعر کو سمجھ سکیں، اس سے محفل میں وقار اور معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر اچھے شعر پر وہ دل سے داد دیتے ہیں اور ان کی داد میں ایک خلوص، ایک تسلیم اور ایک تربیت یافتہ ذوق کی جھلک ہوتی ہے۔

مشاعرے کے اختتام پر طعام کا خصوصی اہتمام ان کی اپنی نگرانی میں ہوتا ہے۔ وہ محض دعوت نہیں دیتے، بلکہ ایک با اخلاق، مہربان اور دردمند میزبان کی حیثیت سے خود ہر فرد کے پاس جا کر نہایت محبت اور انکساری سے پوچھتے ہیں: ''کیا کسی چیز کی ضرورت ہے؟ حکم کریں۔''

یہ انداز ان کی بزرگی، سادگی اور اعلیٰ اخلاقی مقام کی دلیل ہے۔ ان کے ہاں شعرا و ادبا کو وہ عزت و تکریم ملتی ہے جو آج کل کے مادی اور شور زدہ ماحول میں ناپید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص ایک بار ان کی بزم میں شامل ہو، وہ بار بار اس فیض یافتہ محفل میں آنے کی خواہش رکھتا ہے۔

جسٹس صاحب کا گھر نہ صرف ایک علمی خانقاہ ہے بلکہ ایک ایسا گوشۂ عافیت بھی ہے جہاں دلوں کو سکون، فکر کو تازگی اور روح کو روشنی میسر آتی ہے۔ آپ کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے خاندانی پس منظر اور روحانی تربیّت پر نگاہ ڈالنی ہوگی۔ یہ خانوادہ ہمیشہ سے کلمۂ حق کہنے کے لیے معروف رہا ہے۔ دولت و ثروت، سماجی رُتبہ اور دنیاوی آسائشیں ان کے قدموں میں رہیں، مگر انہوں نے ہمیشہ درویشی، انکساری اور روحانیّت کو اپنا شعار بنایا۔ اس خانوادے کی رگ رگ میں عشقِ الٰہی، صداقت اور سچائی کی روشنی دوڑتی ہے، جس کی جھلک جسٹس صاحب کی زندگی کے ہر گوشے میں نظر آتی ہے۔

ان کے والدِ گرامی، جناب میاں کریم بخش مرحوم، ایک نابغۂ روزگار ہستی تھے۔ انجینئرنگ جیسے پیچیدہ شعبے میں ان کی فنی مہارت، پیشہ ورانہ دیانت، اور تخلیقی بصیرت اپنی مثال آپ تھی۔ لیکن ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو ایسا بھی تھا جس نے انہیں عام ماہرین سے ممتاز کر دیا، وہ ان کی روحانی وابستگی، درویشانہ مزاج اور نیک نامی تھی۔ ان کی زندگی علم و عمل، ذکر و فکر اور خدمت و شرافت کا ایک حسین امتزاج تھی۔ یہی وہ اوصاف تھے جنہوں نے جسٹس صاحب کی شخصیت کی بنیادیں استوار کیں۔

جناب میاں کریم بخش مرحوم نے اپنے صاحبزادے کی تربیت نہایت فکر و محبّت سے کی۔ جب وہ تعلیم کے مراحل طے کر رہے تھے تو والدِ محترم انہیں اپنے مرشد، حضرت قبلہ سیّد رجب علی شاہ قادری، قلندری، سروری کے حضور لے گئے تا کہ انہیں روحانی سلسلے میں بیعت کیا جا سکے۔ بیعت کے بعد ان کے مرشد نے انہیں شریعت کی اتباع کرنے، نماز، روزے کی پابندی کرنے اور وظائف قادریہ روزانہ پڑھنے کی تلقین کی۔ بعد ازاں جب انہوں نے 1963ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا تو وہ پھر مرشد پاک کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ وہ ان کی راہنمائی فرمائیں کہ آیا وہ سی ایس ایس کا امتحان دیں یا وکالت کا پیشہ اختیار کریں۔ صاحبِ بصیرت مرشد نے انہیں حکم دیا ''تم وکالت کرو، غریبوں کے مقدمے مفت لڑنا، محنت کرنا، سستی نہ کرنا، پیسے کے پیچھے مت بھاگنا، عدالت میں ڈٹ کر بات کرنا اور جج کو کہنا کہ اس کرسی پر میں بیٹھوں گا''۔ میاں نذیر اختر نے اپنے مرشد کے فرمان پر عمل کیا، غریب غربا اور معاشی طور پر کمزور افراد کی مفت وکالت کی اور بالآخر 1988ء میں لاہور ہائیکورٹ کے جج بنے۔ منصبِ عدل پر فرائض سرانجام دینے کے دوران وہ علم، عدل، دیانت اور روحانیت کو یکجا کرنے والی ایک نادر ہستی کے طور پر سامنے آئے۔ اگر جسٹس (ر) میاں نذیر اختر صاحب کی زندگی پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ وہ علم و عمل کے ایسے مجاہد ہیں جنہوں نے زندگی کے ہر محاذ پر اسلام کی سچائی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حرمت، اور ملّتِ اسلامیہ کی عزت و وقار کا دفاع بڑے وقار اور دانشمندی سے کیا ہے اُن کا قلم بھی بیدار ہے اور زبان بھی حق گو؛ ان کا دل عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے معمور ہے اور ان کی پیشانی دین کی سربلندی کے جذبے سے روشن۔ جہاں وہ عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر انصاف کا علم بلند کرتے، رہے وہاں وہ خطیبِ بے مثل بن کر اسلامی تعلیمات کی حقانیت پر مدلل انداز میں روشنی ڈالتے رہے۔ جلسوں، مذاکروں اور علمی اجتماعات میں جب وہ لب کشائی کرتے ہیں تو علم و استدلال کے دریا بہہ نکلتے ہیں۔ ان کی باتوں میں ایک عجیب کشش، دلیل میں گہرائی، اور لب و لہجے میں ایسی سچائی ہوتی ہے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

اسلام دشمن قوتیں، چاہے وہ فکر کی صورت میں سامنے آئیں یا سازش کے خول میں چھپی ہوں، جسٹس صاحب کی بے باک آواز اور جرأتِ کردار کے سامنے بے بس نظر آتی ہیں۔ خاص طور پر جب بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس پر حملے ہوئے یا دینِ اسلام کے بنیادی عقائد کو چیلنج کیا گیا، تو وہ خاموش نہ بیٹھے۔ ایسے نازک مواقع پر انہوں نے نہ صرف دلیرانہ تقاریر کے ذریعے ان حملہ آوروں کو آئینہ دکھایا بلکہ اپنے قلم کو بھی تلوار بنایا۔ ان کی تحریریں، ان کے مضامین، اور ان کی کتب آج بھی اسلامی غیرت و حمیّت کے باب میں ایک روشن مثال ہیں۔

ان کے علمی مذاکرے میڈیا پر نشر ہوتے ہیں تو سننے والا ہر فرد محسوس کرتا ہے کہ علم، وجدان، اور ایمانی غیرت کا امتزاج کیسا ہوتا ہے۔ وہ صرف عالم نہیں، فقط جج نہیں، محض خطیب نہیں، بلکہ وہ ایک عہد، ایک فکر اور ایک مزاج کا نام ہیں جو دین کی سربلندی، عدل کی روشنی اور عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے چراغ کو لے کر اپنی پوری زندگی سفر میں رہے۔

جسٹس ریٹائرڈ میاں نذیر اختر کی ذات ایک ہمہ گیر اور روشن مینار کی مانند ہے، جو مختلف علمی، فکری اور روحانی میدانوں میں اپنی روشنی بکھیرتی ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق قانون دان ہیں بلکہ ایک جیّد دینی اسکالر، قادرالکلام شاعر، پراثر خطیب، صاحب بصیرت محقق، تاریخ کے نبّاض مؤرخ، حکمت وطب کے ماہر، اور گہری بصیرت رکھنے والے مصنّف بھی ہیں۔ ان کی شخصیت کا ہر پہلو اپنی جگہ ایک مکمل جہان رکھتا ہے۔

ان کی زندگی کی داستان محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ جہدِ مسلسل کا ایک درخشندہ باب ہے۔ ان کی ساری تگ و دو دینِ اسلام کی سربلندی، ناموسِ رسالت کے تحفظ، ظالم و جابر حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق کی جرأت مندانہ صدا بلند کرنے، مظلوموں کو انصاف دلانے، قوم کی اصلاح اور معاشرتی ظلم و استحصال کے خلاف جہاد پر مشتمل ہے۔

انہوں نے اپنے قول و فعل، قلم و زبان، علم و عمل کے ذریعے معاشرے کے ہر طبقے کو بیداری، روشنی اور حق کا شعور عطا کیا۔ ان کا طرزِ زندگی اسلاف کی پیروی میں ایک ایسا چراغ ثابت ہوا جو ظلمت شب میں روشنی کی علامت بن گیا۔ وہ اس دورِ گم گشتہ میں ایک زندہ روایت کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جنہوں نے اپنے علم، کردار اور حوصلے سے سچائی، غیرت اور دینی حمیّت کی شمع کو ہمیشہ فروزاں رکھا ہے۔

ان کی علمی و عملی زندگی کامیابیوں کا ایک روشن باب ہے، جو ان کی غیر معمولی صلاحیتوں، انتھک محنت، اور بلند حوصلگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انہوں نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز نہایت عزم اور لگن سے کیا، اور بی اے آنرز اور ایل ایل بی جیسے اہم تعلیمی مراحل میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لا کالج لاہور سے 1963ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی، اور اپنی شاندار کارکردگی کے اعتراف میں ''رول آف آنر'' جیسے اعلیٰ اعزاز سے نوازے گئے، جو صرف ان طلبہ کو عطا کیا جاتا ہے جو علمی میدان میں غیر معمولی کارکردگی دکھائیں۔

علمی میدان میں ان کی قابلیت کا دائرہ محض قانون تک محدود نہیں رہا، بلکہ انہوں نے بین الاقوامی اُمور میں بھی خصوصی ڈپلومہ (D.I.A) حاصل کیا، جو ان کی بین الاقوامی سیاسی و قانونی بصیرت کا مظہر ہے۔ ان کی انہی صلاحیتوں نے انہیں مختلف علمی، تدریسی اور عدالتی مناصب پر فائز ہونے کے قابل بنایا۔

عدلیہ کے شعبے میں ان کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ وہ لاہور ہائی کورٹ کے معزز جج کی حیثیت سے فرائض انجام دے چکے ہیں اور دو بار قائم مقام چیف جسٹس کے منصب پر بھی فائز رہے۔ ان کی عدالتی زندگی شفافیت، دیانت، اور عدل کی بہترین مثال رہی ہے۔ وہ ان چند شخصیات میں شامل ہیں جنہوں نے قانون کو صرف کتابی علم نہیں سمجھا بلکہ اسے عملاً مظلوموں کی دادرسی اور ظالموں کی سرکوبی کا ذریعہ بنایا۔

ان کی خدمات کا دائرہ صرف عدالت تک محدود نہ رہا، بلکہ وہ سماجی، تعلیمی اور دینی شعبوں میں بھی بھرپور طور پر متحرک رہے۔ وہ پنجاب بیت المال لاہور کے سابق امین ہیں، جہاں انہوں نے غریبوں، یتیموں اور ناداروں کی فلاح کے لیے بے شمار عملی اقدامات کیے۔ اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے ممبر کی حیثیت سے انہوں نے بڑا فعال کردار ادا کیا۔

تعلیم کے میدان میں بھی ان کا کردار نمایاں رہا۔ وہ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور اور بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے سینڈیکیٹ کے ممبر کے طور پر کام کرتے رہے، جہاں انہوں نے اعلیٰ تعلیمی پالیسی سازی میں حصہ لیا۔ اس کے علاوہ وہ پنجاب یونیورسٹی لاکالج لاہور میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر بھی خدمات سرانجام دے چکے ہیں، جہاں انہوں نے سینکڑوں طلبہ کو قانون کا شعور دیا جو بعدازاں قابل وکیل یا جج بنے۔

دینی غیرت اور ناموسِ رسالت کے تحفظ کے جذبے سے سرشار ہو کر ہونے کی بنا پر انہیں ختمِ نبوّت لائرز فورم لاہور کا سرپرست بنایا گیا، جہاں انہوں نے عقیدۂ ختمِ نبوّت کے تحفظ کے لیے وکلاء کو منظم کیا اور آج تک ان کی راہنمائی کر رہے ہیں۔ اس شعبے میں خدمات کی بنا پر نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن نے

انہیں ''ختمِ نبوت گولڈ میڈل'' سے نوازا۔

ان کی علمی و قانونی خدمات کے اعتراف میں انہیں بے شمار اعزازات اور ایوارڈز سے نوازا گیا۔ راولپنڈی بار ایسوسی ایشن کی جانب سے انہیں ''نشانِ بار'' جیسا منفرد اعزاز عطا کیا گیا، جو صرف ان قانونی ماہرین کو دیا جاتا ہے جن کی خدمات غیر معمولی ہوں۔

یقیناً جسٹس (ر) میاں نذیر اختر کی شخصیت ہمارے علمی، عدالتی، سماجی اور دینی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، جن کی زندگی نوجوان نسل کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

ادبی میدان میں ان کا سرمایۂ کتب ان کی فکری وسعت، علمی گہرائی اور دینی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ ان کی تحریریں محض الفاظ کی ترتیب نہیں بلکہ ایک عہد کی فکری رہنمائی، علمی روشنی اور روحانی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ اب تک ان کی گیارہ گراں قدر کتب مختلف النوع موضوعات پر منظرِ عام پر آ چکی ہیں، اور ہر کتاب اپنے دائرہ اثر میں ایک مکمل اور جامع علمی و فکری اکائی کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان کے شعری ذوق کا حسین امتزاج ہمیں ''عود نگر'' (مجموعہ حمد و نعت)، ''شمعِ خیال'' (مجموعۂ غزل) اور ''فکرِ فراواں'' (مجموعۂ نظم) میں دکھائی دیتا ہے، جہاں ان کا قلبی احساس اور فکری ارتقاء شعری قالب میں ڈھل کر قاری کے دل و دماغ کو مسخر کر لیتا ہے۔

نثری کتب میں ''مظفر حوا'' ایک ایسی کتاب ہے جو قاری کے اندر روحانی سرشاری پیدا کرتی ہے جشن عید میلاد النبیؐ کی اہمیت کو واضح کرتی ہے، جبکہ ''تحفظِ ناموسِ رسالتؐ'' ایک ایسا فکری قلعہ ہے جس میں عشقِ رسولؐ کے تحفظ کا جذبہ پوری شدت سے موجزن ہے۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی اسی جذبے کی تازگی کا اظہار ہے۔

''حیاتِ سیّد رجب علی شاہؒ'' ایک سوانحی شہکار ہے، جس میں انہوں نے اپنے مرشد کامل کی زندگی کو صرف قلم سے بیان نہیں کیا بلکہ روح سے محسوس کیا ہے۔ اسی طرح ''حاضری سے حضوری تک'' عاشقِ رسولؐ ملک محمد ممتاز قادری شہید کی زندگی اور عشقِ رسولؐ کی داستان ہے۔ اعلیٰ عدلیہ (اسلام آباد ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ پاکستان) میں میاں نذیر اختر نے بڑی محنت اور جرأت سے اس عاشقِ رسولؐ کا دفاع کیا۔ اگر وہ مقابلے کا امتحان پاس کر کے ایک سرکاری افسر بنتے اور ریٹائرڈ ہو جاتے تو انہیں ایک عاشقِ رسولؐ کے دفاع کا اعزاز حاصل نہ ہوتا۔ یہاں بھی ان کے مرشد کی طرف سے وکالت کے حکم کی حکمت عیاں ہوتی ہے۔

''عودنگر'' میں ان کے نعتیہ کلام کی خوشبو قاری کو ایک نئی دنیا میں لے جاتی ہے جس میں ادبِ رسولؐ اور عشقِ رسولؐ کے پھول جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے شعوری طور پر اپنے اشعار میں حضور نبی اکرم ﷺ کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھ کر ان کی نسبت سے ''آپ'' یا ''اُن'' کے الفاظ تحریر کیے ہیں۔ کتاب ''عائلی نظام کی تخریب کا نیا قانون'' ایک علمی و قانونی تجزیہ ہے جس میں اس قانون کے غیر اسلامی ہونے اور عائلی نظام کے لیے تباہ کن ہونے کے پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ان کی بصیرت افروز فقہی اور معاشرتی فکر کا نچوڑ ہے۔ یہ کتاب بروقت اسلامی نظریاتی کونسل اور قومی اسمبلی کے ممبران کو بھیجی گئی۔ مجوزہ قانون پر صدرِ پاکستان کے دستخط نہ ہونے کے باعث یہ باضابطہ قانون نہ بن سکا۔

''قادیانیت کی اصلیت'' ان کے دینی شعور، تحقیقی مہارت اور عقیدۂ ختمِ نبوتؐ کی صحیح تفہیم کی مظہر ہے جبکہ ''سر سیّد - بے حجاب'' میں انہوں نے اس معروف شخصیت کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لے کر ان جہتوں کو آشکار کیا ہے جن سے حقیقت عیاں ہوتی اور سر سیّد کے حق میں پروپیگنڈے کا سحر ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان موضوعات پر انہوں نے محض تحریر نہیں کی بلکہ ان کا حق ادا کر دیا ہے، تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ ان کی ہر کتاب صرف سرسری مطالعے کے لیے نہیں، بلکہ تفکر و تدبر، اصلاحِ احوال اور بیداریِ شعور کے لیے ایک دعوت نامہ ہے۔ باالفاظِ دیگر ان کی ہر کتاب محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک فکری تحریک کی نمائندہ ہے۔ ہر تحریر کے پسِ پردہ ایک جذبہ، ایک مقصد، اور ایک نظریاتی محرک کارفرما ہے، جس نے ان کے قلم کو رواں کیا۔ انہوں نے مختلف ادوار میں جن موضوعات کو اپنا مرکزِ فکر بنایا، وہ محض حالات کی پیداوار نہیں تھے بلکہ گہرے دینی، فکری اور سماجی تقاضوں کے نتیجے میں سامنے آئے۔ ان کی ہر تصنیف اپنے اندر ایک مکمل دنیا سموئے ہوئے ہے، جو قاری کو نہ صرف علم کی روشنی عطا کرتی ہے بلکہ فہم، شعور اور بصیرت کی نئی راہیں بھی دکھاتی ہے۔

تاہم، ان کتب کے محرکات، مضامین، اُسلوب اور فکری اپچ پر تفصیلی اظہارِ خیال اس مختصر مضمون کی گنجائش سے باہر ہے۔ لہٰذا قاری کی علمی تشنگی کے پیشِ نظر، ان شاء اللہ جلد ہی ہر کتاب کا الگ الگ بھرپور تعارف و تجزیہ پیش کیا جائے گا، تاکہ میاں نذیر اختر صاحب کی علمی و فکری خدمات کا احاطہ کیا جا سکے اور قاری ان کے ادبی ورثے سے بخوبی روشناس ہو سکے۔ اس ورثے کے علاوہ انہوں نے اپنے ایک اور ورثے کا ذکر اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے:-

بانٹ لینا میری وراثت کو
میرا ترکہ ہے دردِ دل یارو

(جاری ہے)

ابیاتِ سندھی کا ادبی تجزیہ

مرزا کاظم رضا بیگ/سندھ

سندھی شاعری کے اُفق پر بارھویں صدی ہجری کے آخری عشرہ میں ایک تابناک ستارہ طلوع ہوا، جس کی ذات ولایت اور شاعری کا معتبر و مقدس ملاپ تھی۔ یہ بزرگ سلطان الاولیاء خواجہ محمد زمان تھے، جن کے اجداد خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں سنہ ۷۸۶ء میں عرب سے ہجرت کر کے ٹھٹھ میں آباد ہوئے۔ یہ پرآشوب دور تھا۔ اس وقت سندھ کے دو حکمران خاندان سمہ اور سومرا آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ چنانچہ اس داخلی بدامنی کی وجہ سے شہر برباد ہونے لگا تھا، جس کی وجہ سے یہ خاندان بھی سندھ کو خیر باد کہہ کر کچ منتقل ہو گیا، لیکن ان کا روحانی رشتہ سندھ سے ٹوٹ نہ سکا اور سنہ ۱۵۰۴ء میں شیخ عبداللطیف کبیر اپنے سندھی مریدوں کی منت سماجت کی وجہ سے واپس ٹھٹھ آ گئے۔

جب خواجہ صاحب کے اجداد سندھ میں آ گئے تھے، تو اس وقت سندھ میں عربوں کی حکومت تھی اور اگر وہ چاہتے تو انہیں بڑے سے بڑا منصب بھی مل سکتا تھا، لیکن انہوں نے یہ تہیہ کیا کہ وہ اور ان کی اولاد نہ کبھی حکومت کریں گے اور نہ ہی حکومت کا کوئی عہدہ قبول کریں گے۔ ان کی زندگی سادگی اور تحمل و تواضع کا نمونہ تھی۔ انہیں اگر کوئی شیخ یا پیر کہتا تو ناراض ہو جاتے تھے۔ گو اس زمانے میں بھی ان کے مریدوں کا حلقہ بے حد وسیع تھا۔

حضرت سلطان الاولیاء ۲۱ رمضان المبارک سنہ ۱۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ قدیم تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو صغر سنی ہی سے ربِ کریم سے محبت تھی۔ اپنے والد بزرگوار کی نگرانی مین قرآن مجید حفظ کیا اور ٹھٹھ کے ایک نہایت ہی تبحر عالم مخدوم محمد صادق نقشبندی کے مدرسے میں دینی علوم کی تحصیل مکمل کی۔ خواجہ صاحب نہایت ہی تیز فہم تھے اور دن رات محنت کر کے نوجوانی میں ہی شرعی علوم میں مہارت حاصل کر لی تھی۔

اسی دوران آپ مخدوم ابوالقاسم نقشبندی کے معتقدوں میں شامل ہو گئے اور مخدوم آدم کے پوتے اور اپنے والد محترم کے دوست خواجہ ابوالمساکین میاں محمد کی خدمت میں رہتے ہوئے درجہ بہ درجہ طریقت کے بحر میں سے مشاق تیراک کی طرح اسرار و رموز کے موتی نکالتے رہے اور یوں تصوف میں کمالیت پانے کے بعد خلافت کا خرقہ حاصل کیا اور جب حضرت ابوالمساکیں ہجرت کر کے مکہ گئے تو خواجہ صاحب کو سندھ و ہند میں اپنا جانشین مقرر کر گئے۔

سندھ میں نقشبندی مکتبہ فکر گیارھویں / بارھویں صدی ہجری میں پھیلا۔ زیریں سندھ میں مخدوم القاسم درس نقشبندی اور مخدوم آدم اور بالائی سندھ میں مخدوم محمد اسماعیل پریالوئی، جن سے راشدی خاندان کے جدِ امجد حضرت محمد بقا شاہ اور پیر محمد راشد نے فیض حاصل کیا، اس سلسلے کے بانی سمجھے جاتے تھے۔

حضرت مجدد الف ثانی، شیخ احمد فاروقی سرہندی (متوفی ۱۰۳۴ھ) کے فیوض و برکات کے سندھ میں جاری و ساری ہونے کا بیان آپ کے مکتوبات نیز روضۃ القیومیہ، مکتوباتِ معصومیہ اور مکتوباتِ سیفیہ میں آیا ہے۔ بہر حال جو شہرت سلطان الاولیاء کو حاصل ہوئی وہ اس دور کے کسی بزرگ کو سندھ میں حاصل نہ ہو سکی۔ دور دور سے علماء اور صلحا آپ سے نیاز حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔

نقشبندی سلسلے میں تزکیہ نفس کے لیے شریعت کی سخت پابندی، ذکر خفی اور مراقبہ کرنا، مذہبی احکامات رائج کرنے کے لیے منظم طور پر کوشش کرنا، اہم اصول ہیں اور میں تو یہاں کہوں گا کہ یہ بزرگانِ نقشبندیہ کے فیوض و تعلیمات کا ہی نتیجہ تھا جو برطانوی ہندوستان کے مسلمانوں میں اپنے تشخص کا احساس بیدار ہوا۔ کیونکہ وحدت الوجود کے فروغ کے نتیجے میں ہمارے یہاں ہندو مسلم بھائی، بھائی یا ایک قومی نظریہ کی بنیاد پڑی تھی، لیکن شیخ احمد فاروقی سرہندی کے فلسفہ وحدت الشہود نے برطانوی ہندوستان میں دو قومی نظریہ کی داغ بیل ڈالی۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر برطانوی ہند کے مسلمانوں نے اپنی سیاسی تحریک کو آگے بڑھایا اور انگریز اور کانگریس کی بساط کو اُلٹ دیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب سخت مجاہدہ اور ریاضت کے عادی تھے۔ حجر کے بعد سے چاشت تک مسلسل مراقبہ میں رہتے تھے اور استغراق کا یہ عالم تھا کہ سینکڑوں رشد و ہدایت کے طالب جذب اور بیخودی میں گم رہتے تھے۔ شب بیداری ان کا معمولی تھا اور لوگوں کو سوتا ہوا دیکھ کر تعجب فرماتے تھے کہ یہ لوگ اپنی زندگی کس طرح ضایع کرتے ہیں۔ شریعت کے سخت پابند تھے اور فرماتے تھے کہ اگر آج مستحب ترک کرو گے تو کل سنت ترک کرنے پر آمادہ ہو گے۔ اس کے بعد ترکِ فرض کی نوبت آئے گی، اور ترکِ فرض بعض اوقات کفر تک پہنچا دیتا ہے۔

خواجہ محمد زمان نے اپنے باطنی فیض سے سارے سندھ اور کچ کے علاقے کو فیض یاب کیا اور تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آپ کی روحانیت کا دور دور تک شہرہ تھا۔ خواجہ محمد زمان ظاہری اور باطنی خوبیوں کا مجسمہ تھے اور شریعت اور طریقت کی تمام فضیلتوں پر فائز تھے۔ ان کی گفتگو نہایت سنجیدہ، مختصر اور پرمعنی ہوتی تھی۔ راضی برضا، توکل، صبر، سخاوت، بے اسبابی اور گوشہ نشینی آپکے کردار کی خوبیاں تھیں۔ شاعر کی حیثیت سے ''الشعراتلمیذ الرحمٰن'' کے مصداق وہ روشن ضمیر اور ہدایتوں کا سرچشمہ تھے۔

خواجہ صاحب نے اپنی شاعری کو باقاعدہ اسلامی تصوف کے دائرہ میں لا کر طائرِ فکر کو نئی پرواز بخشی۔ سندھ کی قدیم شاعری میں خواجہ صاحب کے

ابیات ہی تمام تر تصوف کے تانے بانے ہیں۔ دوسرے شاعروں مثلاً میوں لطف اللہ قادری، میوں شاہ عنایت رضوی اور حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی طرح انہوں نے عوامی داستاں یا دنیوی قصے کہانیاں بیاں نہیں کی ہیں۔ آپ کے کلام کا موضوع فنا اور وصل کا فلسفہ ہے اور ادبی اور اخلاقی، روحانی اور فنی لحاظ سے، سندھی ادب میں اس کا اعلیٰ مقام ہے۔ آپ کے عارفانہ ابیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب علم لدنی سے نوازے گئے تھے۔ وہ عارف باللہ تھے۔ صلاحیت، شرافت، فہم و فراست کی تابندہ مثال تھے۔ بصیرت اور درایت کے علاوہ ان کی زبان سے کوئی کلمہ نہیں نکلتا تھا۔ اب سلطان الاولیاء کے چند ابیات اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں جو سندھ کے نامور شاعر مرحوم نیاز ہمایونی نے کیا:

جگ ہے رین بسیرا اس کا جس نے جگ کو چھوڑ دیا
سب ہوں تیرے سنگ جو تو نے سب سے ناتا توڑ دیا

یہ بات مولانا روم نے بھی کہی ہے کہ:

چیست دنیا! از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

حقیقت میں یہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ سورۃ المنافقون میں فرمایا گیا ہے کہ "اے مسلمانو! تمہارے مال وزر اور اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہ سراسر نقصان اُٹھائیں گے۔"

سکھ کی آس لگائی مورکھ، سامی دکھ اپناتے ہیں
جس دکھ سے آرام انھیں یہ اسی سے جی بہلاتے ہیں

....

دیکھ چکا جو ساجن کو وہ اور کسی کو دیکھے کیوں
منزل کی جو کھوج لگائے چپ ہو کر وہ بیٹھے کیوں

....

مر گئے راہ محبت میں جو کبھی نہ مرنے والے وہ
ان کے قتل کا بدلہ خود وہ ہو گئے رب کے حوالے وہ
دین خدا کا ہے اسلام اور بھرم اسی کا رکھنا ہے
موت ہے بعد اسلام ہے پہلے باور اس پے کرنا ہے

....

وصل کی ایک گھڑی سے بھی جو دیوانہ دلشاد ہوا
اس کو ملا وہ جس کے کارن جگ آباد ہوا

ابیات سندھی سندھ کے کلاسیکی ادب کا قابل فخر ورثہ ہے۔ سلطان الاولیاء خواجہ محمد زمان شاہ لطیف کے ہم عصر تھے۔ شاہ لطیف سے پہلے قاضی قادری (وفات ۱۶۷۹ء) میوں شاہ عنایت (وفات ۱۷۰۸-۱۴ء) سندھی شاعری میں پختہ روایت قائم کر چکے تھے۔ شاہ لطیف نے اسی روایت کو نہ فقط زیادہ مستحکم کیا، مگر موسیقی کی لے پر بھی اسے ہموار کیا اور تفصیل سے کلام کہا۔ جس کی وجہ سے سندھی الفاظوں کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہو گیا۔

ادبی لحاظ سے خواجہ صاحب کا کلام شاہ لطیف کے مقابلے میں لایا تو نہیں جا سکتا، مگر اس میں تصوف کے جو مخفی راز اور رمزیں پنہاں ہیں۔ یہ وہی سبب ہے جو شاہ لطیف پیرسنی میں صحرانوردی کرتے ہوئے خواجہ صاحب سے ملاقات کی اور ملاقات کے بعد یہ بیت اکثر پڑھا کرتے تھے کہ:

ہم نے دیکھے اہل نظر جو صدق و صفا کے پیکر تھے
واصل تھے جوق سے اور توصیف سے بے شک برتر تھے

خواجہ صاحب کے ان ابیات کو ان کے ایک مرید اور خاص خلیفے شیخ عبدالرحیم گرھوڑی نے ترتیب دیا اور اس کی عربی زبان میں شرح لکھی۔ یہ محض ابیات نہ تھے، لیکن ایک دُرِ بے بہا نہیں۔ جس کی ہر ایک مصرع میں تصوف کے باریک نکات پنہاں ہیں۔ ان ابیات کا ادبی اور اخلاقی، روحانی اور فنی لحاظ سے سندھی ادب میں بہت بڑا مقام ہے۔ یہ عارفانہ علوم "فنا سے پہلے کیا ہے؟" اور "فنا کے بعد بھی کوئی علم ہے؟" کا ایک حسین، دل پذیر اور عالمانہ شاہکار ہے۔

یار ملے نہ کبھی اسے جو اندر باہر میلا ہو
یار ملے تو ایسے ملے جس یار کا تن من اُجلا ہو

....

پریت نہ کر پردیس سے اپنے دیس کا تجھ کو دھیان رہے
مت کر ایسا کام کہ جس میں گھاٹے کا امکان رہے

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر

کتاب میلہ 2025

(5 تا 9 فروری) ایکسپو سنٹر جوہر ٹاؤن لاہور

آ کہ روداد سناؤں تجھے اس میلے کی
جس نے اس دل کو کتب خانہ بنا رکھا ہے

پانچ دن علم و ادب کی جو بہاریں دیکھیں
اُن کی یادوں کو تصوّر میں بسا رکھا ہے

جوق در جوق وہاں لوگ ہزاروں آئے
"بک فیئر" نے جنہیں مشتاق بنا رکھا ہے

اب بھی شائق ہیں بہتؔ لوگ کتب بینی کے
خوب اس شوق کو میلے نے بڑھا رکھا ہے

تھا یہی شوق کہ مل جائیں کتابیں اچھی
جس نے ہر دل میں تجسس کو جگا رکھا ہے

مرحبا، "نستعلیق" ادارے نے کتب میلے میں
منفرد اپنا بھی اسٹال لگا رکھا ہے

یاں ہیں شاہکار کتابیں، قیمت کم کم
انتخاب ان کو ہی لوگوں نے بنا رکھا ہے

دیکھنا شوق کا عالم کہ قدر دانوں کو
علم کی شمعوں نے پروانہ بنا رکھا ہے

علم کی پیاس بجھانے کے لیے ہی اخترؔ
ہم نے میلہ یہ کتابوں کا لگا رکھا ہے

✦✦✦

نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں سے ملیں

پروفیسر نور کمال شاہ/خیبر پختونخوا

کہا جاتا ہے کہ اصل نشہ وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے مگر حقیقت میں نشہ جس قسم کا بھی ہو داناؤں، دینداروں اور دواسازوں کے نزدیک صحت اور مذہب دونوں لحاظ سے مضر ہی ثابت ہوتا ہے خواہ وہ نشہ دولت کا ہو یا حسن کا ہو، شہرت کا ہو یا طاقت کا اور یا نشہ آور اشیاء کا- حقیقت جو بھی ہو بہر حال یہ تو طے ہے کہ ہر بندہ بشر کسی نہ کسی نشے میں مبتلا یا اس کا شکار ضرور ہوتا ہے- ہر کوئی کسی نہ کسی شکل میں کوئی نہ کوئی اضافی نشہ لیتا ضرور ہے اور بقول یاری خان مغموم کے وہ اپنی شخصیت و مزاج میں پائی جانے والی کسی کمی یا خلا کو پر کرنے یا کمی بیشی کو برابر کرنے کے لئے اضافی خوراک کے حصول کی کوششیں بھی کرتا ہے- دولت، حسن، شہرت اور طاقت انسانی مزاج عالی کے بنیادی نشے ہیں اور ان بنیادی نشوں میں اگر خدا نخواستہ کوئی کمی بیشی رہ گئی ہو تو اسے شراب، چرس، بھنگ اور افیون کے معتبر نشوں کے ساتھ ساتھ پان، سگریٹ، نسوار اور حقے کے ثانوی نشوں کی مدد سے پوری کرنے کی بھرپور کوششیں کی جاتی ہیں- تاریخ گواہ ہے کہ 1965 کی لڑائی میں سپاہیوں کے مورچوں میں کھانے پینے کے ضروری اشیاء پہنچانے سے زیادہ اس امر کا خیال رکھا جاتا تھا کہ پٹھان سپاہیوں کے مورچوں میں نسوار کی پڑیاں بڑی مقدار میں بلا تعطل پہنچائی جاتی رہیں تا کہ ان کا نشہ ٹوٹنے نہ پائے اور وہ ڈٹ کر مخالف فوجوں کا مقابلہ کرتے رہیں - نتیجے سے تو آپ یقیناً واقف ہی ہوں گے کہ جنگ کے دوران ان پختون سپاہیوں نے وہ قابل قدر کارنامے کر دکھائے اور مخالفین کے وہ دانت کھٹے کئے کہ جنہیں مدتوں یاد رکھا جائے گا اور دشمنوں تک ان کا برملا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں- کہنے والے کہتے ہیں کہ عین لڑائی کے دوران ہی صدر ایوب خان صاحب خود اس عمل کا مشاہدہ اور نگرانی کرنے اگلے مورچوں تک پہنچ جایا کرتے تھے (ہماری مراد دانت کھٹے کرنے سے ہرگز نہیں بلکہ نسوار رسانی سے ہے)- ریکارڈ کی درستی کے لیے بتاتے چلیں کہ یہاں ہمارے اس مبالغے کا مقصد یہ ثابت کرنا ہرگز نہیں ہے کہ وہ جنگ ہم نے نسوار کے زور سے جیت لی تھی- جس طرح کہ پان کے پیک اور سیگریٹ کے کش سے ملک فتح نہیں کئے جا سکتے بعینہ نسوار سے بھی دشمن کو زیر نہیں کیا جا سکتا مگر بہر حال اس کا فعال کردار اس جیت سے کسی طور بھی منہا نہیں کیا جا سکتا

ہمارے ہاں نشے کو مردانگی کی نشانی سمجھا جاتا ہے اور اپنی اسی مردانگی کو ثابت کرنے کے لئے یار لوگ نہایت شوق سے ڈٹ کے نشہ کرتے ہیں-

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم بذات خود نسوار اور حقے کو مردانگی کی علامت اس لئے بھی سمجھتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ مردوں ہی کے چونچلے ہیں اور ہم نے آج تک کسی خاتون کو منہ کے اندر سے نسوار تھوکتے یا گڑ گڑ کرتے حقہ پیتے نہیں دیکھا-----------!!!!

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو تب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

چنانچہ اسی شوق کے بینر تلے وطن عزیز میں مختلف قسم کے ماکولات و مشروبات کو بطور نشہ استعمال کیا جاتا ہے- نسوار کو اگر ہمارے پختونخوا کا قومی نشہ قرار دیا جا سکتا ہے تو سیگریٹ اور حقے کو پنجاب کا نشہ کہلانے کا حق بہر حال حاصل ہے- ہمارے پنجاب کے شیر دل جوانوں سے لے کر جی دار بوڑھوں تک سب سیگریٹ ڈٹ کے پیتے ہیں- ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک بندہ ہر دم منہ میں بیک وقت دو سیگریٹ دبائے دھواں اڑاتا رہتا تھا؛ کسی فارغ البال بندے نے اس کی وجہ پوچھی تو موصوف کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر صفائی سے کہنے لگے" ایک سیگریٹ میری اپنی اور دوسری اپنے دوست کی یاد میں سلگا کے پیتا ہوں جو روزی روٹی کی فکر میں امارات میں مقیم ہیں"- چند دنوں بعد اسی بندے کو ایک سیگریٹ منہ میں دبائے دیکھ کر پوچھنے والے نے حیرت سے سوال کیا،"بھئی! ایک سیگریٹ کیوں؟ کیا دوست کو بھلا بیٹھے ہو"تو جواب ملا: جی نہیں؛ دوست کو بھی کوئی بھلا سکتا ہے بھلا؛ یہ اسی کی یاد کی سیگریٹ ہے، میں نے تو عرصہ ہوا پینا چھوڑ دیا ہے---------"-

اسی طرح پان کو سندھ کا صوبائی اور ثقافتی نشہ قرار دینے میں بھی کوئی عار نہیں- بلوچستان چونکہ مختلف تہذیبوں کا دیس ہے اس لئے یہاں کے باسی مذکورہ بالا تمام نشوں کو کھلے عام استعمال کر کے قومی یک جہتی کا بین ثبوت دیتے چلے آئے ہیں-

استاد یاری خان کے مطابق نشہ دراصل ہمارے خاکی وجود میں موجود ایک کیفیت کا نام ہے جس کے دم سے ہم خود کو آسمان پہ اڑتا ہوا محسوس کرتے ہیں اور ہمارے قدم زمین پہ تب ہی لگتے ہیں جب کوئی بڑھ کر ہمیں ہماری اوقات بتا دیتا ہے- بیرونی نشہ صرف محرک ہی بنتا ہے- کسی شاعر نے پشتو ورژن میں خوبصورتی سے وضاحت کی ہے کہ-----

کہ شرابو کے نشہ وے نو بوتل بہ گڈیدو
(نشہ شراب میں ہوتا تو ناچتی بوتل)

ہم نے ایک دن پوچھا" کہتے ہیں نشہ استعمال کرنے سے عمر گھٹتی ہے اس میں کتنی صداقت ہے؟"

تڑپ کر بولے "کون کہتا ہے؟ مطالعہ پاکستان کے مطابق ہمارے ہاں اوسط عمر ستر سال ہے مگر ہمارے محلے کا شیدا پچھلے سال چھیانوے سال کی عمر میں مرا، تمہیں یاد ہوگا کہ مرحوم آخر تک کس بے دردی سے حقہ استعمال کرتا رہا؛ عمر کا نشے سے بھلا کیا تعلق!!"

یہ تو واضح ہے کہ ہم اپنی شخصیت کے گھٹتے بڑھتے رعب داب اور شان وشوکت کو پورا کرنے کے لئے اضافی خوراک کے طور پر نشہ آور اشیاء لیتے ہیں مگر اضافی نشے کا کمال یہ ہے کہ یہ ہر جگہ اپنی موجودگی کے ان مٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے- سگریٹ کا کثیف دھواں اور اس کی تیز بو گھنٹوں منہ، جسم اور کمرے کو مہکانے کے ساتھ ساتھ اردگرد موجود دل و دماغ کو بھی معطر کرتی رہتی ہے تو دوسری طرف پان کے سرخی مائل گہرے رنگین نشانات منہ اور دانتوں سمیت کمرے کی فرش پہ بھی جا بجا بآسانی ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں- ان تمام اشیاء میں واضح اور ناقابل تردید ثبوت نسوار کے ہوتے ہیں جو چھوٹی، درمیانہ اور بڑے سائز کے گولیوں کی صورت میں تھوک کر دروازے کے پیچھے، کرسیوں اور چارپائی کے نیچے ہمہ وقت لڑھکائے جاتے رہتے ہیں اور خشک ہوکر بچوں کے کھیلنے والی بلوریوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں - ندیدہ بچے اپنے بزرگوں کی آنکھ بچا کر انہیں جمع کر لیتے ہیں اور ان ہی کے ساتھ گولیاں کھیلتے ہیں-

مذکورہ بالا تمام نشوں میں نسوار ہی وہ نشہ ہے جو کم ضرر رساں اور انسانی وجود کے لیے نسبتاً کم نقصان دہ ثابت ہوا ہے- سعودی شیخوں کی عقل پہ ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ انہوں نے جانے کیا سوچ کر اس معصومانہ نشے پر پابندی عائد کردی ہے- شاید وہ سوچ رہے ہوں کہ سرحد کے پختون نسوار کے ذریعے صوبائی تعصب پھیلانے کی مذموم کوشش کر سکتے ہیں مگر اس مفروضے کا حقیقت سے بالکل اسی طرح کوئی تعلق نہیں جیسے پان سگریٹ سے لاتعلق ہے- ان شیوخ کو پابندی اگر لگانی ہی تھی تو شراب اور نسوانی شباب پہ لگاتے جو وہاں کھلے عام مل رہی ہیں اور عربوں کی غیرت وحمیت کے ساتھ ساتھ وہاں کے آہنی قانون کو بھی کھلم کھلا چیلنج کر رہی ہیں- ان دنوں نسوار کے تھیلے کے بغیر امارات کے ہوائی اڈے پہ اترنے والے مزدور کار کا دل یہ سوچ سوچ کے خون کے آنسو روتا ہے کہ----

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تو نہیں تھا، تیرے ساتھ ساری دنیا تھی

نسوار سے نہ تو ماحول کو کوئی خطرہ لاحق ہے نہ ہی یہ فضا کو آلودہ کرتا ہے- تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں نسوار سے امن وامان اور لاقانونیت کا مسئلہ کبھی بھی پیدا نہیں ہوا- نسوار کا برا اثر آج تک منہ اور دانتوں کے سوا کسی عضو پر پڑتے نہیں دیکھا؛ دل تنومند، جگر تازہ، پھیپھڑے مطمئن اور معدہ سلامت ہی رہتا ہے - نسوار سے کبھی ذہن و دماغ میں کھلبلی مچتی بھی نہیں دیکھی- سب سے بڑا فائدہ یہ کہ ہم نے آج تک اس نشے میں کسی کو بے خود یا مدہوش ہوتے نہیں دیکھا- دوسرے نشے مثلاً شراب یا چرس پی کر مدہوش ہونے والے نوجوان باپ کی سفید داڑھی میں ہاتھ پھیرتے ہوئے معشوق کے خوشبودار زلفوں کا تصور پیدا کرتے ہیں اور باپ کی برستی لاٹھی ہی ان کی اس کیفیت کو دور کرتی ہے مگر نسوار میں اس قسم کی کوئی صورتحال پیدا نہیں ہوتی - بدبو نہ کوئی دھواں اور نہ ہی کسی قسم کی بد تمیزی و بداخلاقی کا خدشہ؛ بس پلاسٹک کی پڑیا کھول کے انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے اپنی ظرف اور منہ کے سائز و زاویے کے مطابق گولا بنائیں (گولی سے گولے تک کا سفر زندگی کے مختلف درجوں میں مختلف ہی ہوتا ہے) اطمینان سے یہی گولا تھام کر دائیں یا بائیں ہونٹ کے نیچے دبا دیا اور جب بھی ضرورت کے تحت منہ خالی کرانا مقصود ہوا اطمینان سے یہی گولا کسی کرسی یا چارپائی کے نیچے گرا کر ایک طرف لڑھکا دیا- خدا بخشے ہمارے پشتو کے مزاح نگار اور کامیڈین میراوس اکثر ایک دلچسپ لطیفہ بیان کرتے تھے کہ کسی تقریب کے دوران کارپٹڈ تاریک ہال کے وسط میں تشریف فرما ایک بندے نے منہ موڑ کر پیچھے بیٹھے صاحب سے بڑی رازداری سے پوچھا کہ" جناب! نسوار کدھر پھینکنی ہے یہاں؟"

" اپنے آگے بیٹھے شخص کے واسکٹ کی جیب میں"- پیچھے بیٹھے صاحب نے اطمینان سے جواب دیا-

" ہیں! اگر اس شخص نے برا منایا تو پھر کیا ہوگا؟" اس نے حیرت پوچھا

" کیوں! کیا تم نے برا منایا؟ میں بھی تو آپ کے واسکٹ کی جیب آدھی بھر چکا ہوں"-

ہم وطنوں کے مزاج کی اٹھان اور اتار چڑھاؤ کو مدنظر رکھ کر ہم دفع شر کے لئے نشہ ضروری سمجھتے ہیں کہ نشہ ملے گا تو وہ اپنے آپ اور آپے میں رہیں گے ورنہ رمضان کے روزوں کی حالت میں جب نشے کی ممانعت ہوتی ہے ہماری کرتوتوں سے سبھی واقف ہیں - لڑائی جھگڑے، گالم گلوچ اور ایک آدھ بندے کا سر پھاڑے بغیر ہمیں سکون ملتا ہی کب ہے بھلا---!!!

سوائے میرے عزیز ہم وطنو! لگے رہو اور اپنی زندگی جیو- سگریٹ، چرس نسوار وغیرہ کو ہم معمولی اور بے ضرر ہی سمجھتے ہیں؛ اب تو ہیروئن اور آئس کی شکل میں اس کی ترقی یافتہ شکلیں وجود میں آ چکی ہیں اور زندگی سے بیزار افراد کے لئے کافی حوصلہ افزا بھی ثابت ہورہی ہیں......!!!!

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

سرور عالم راز/کینیڈا

دنیا کی زبانوں میں اردو وہ واحد زبان ہے جس کے ہر دور میں ہزاروں شعرا دادِ سخن سنجی دیتے رہے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر دور میں عظمت و ناموری معدودے چند شعرا کا ہی حصہ رہی ہے۔ انہیں شعرا پر بیشتر کتابیں اور مقالے لکھے گئے ہیں، وہی تحقیق و تنقید کا موضوع رہے ہیں اور انہیں کے نام سے اردو شاعری کے پرستار عموماً واقف ہیں۔ باقی کے ہزاروں شعرا کو اپنی شناخت اور تشخص قائم کرنے کے لیے ہمیشہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ مشاعرے، اخبار و رسائل (موجودہ دور میں) ریڈیو اور ٹیلی ویژن، مناظرے اور مباحثے اور گروہ بندی اس جدوجہد کے عناصر خمسہ ہیں۔ ان عناصر کو بخوبی استعمال کرنے کے لیے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طرح شاعر کی دسترس ان پر ہو، بلکہ یہ بھی لازم ہے کہ وہ ان کو استعمال کرنے کے طریقوں سے واقف ہو اور انہیں استعمال کرنے کے لیے تیار بھی ہو۔ خصوصاً آخری دو عناصر کے استعمال میں جو حربے بروئے کار لانے پڑتے ہیں، ان کے لیے ہر طبیعت تیار بھی نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں اگر کوئی شاعر طبعاً خاموش اور گوشہ نشین ہو تو اس کی شناخت اور تشخص کا قیام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ راز چاند پوری مرحوم کا شمار اسی زمرہ میں تھا۔ چنانچہ اپنے منفرد اندازِ فکر اور ممتاز طرزِ سخن کے باوجود وہ تقریباً پچاس سال ادب و شعر کی خدمت کر کے یہ کہتے ہوئے راہی ملکِ عدم ہو گئے کہ

سراپا سوز ہوں ہم نوائے سازِ فطرت ہوں
تعجب ہے مری آواز پہچانی نہیں جاتی

راز مرحوم کو دنیائے ادب سے اس سلسلہ میں جو شکوہ تھا، وہ اشعار کی صورت میں گاہے گاہے نوکِ قلم پر آیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ:

میں بندۂ تسلیم ہوں، خود کام نہیں ہوں
خوش نوش ہوں، مخمورِ مئے عام نہیں ہوں
گمنام ہوں، گمنام سہی بزمِ ادب میں
اے راز یہ کیا کم ہے کہ بدنام نہیں ہوں

سچ پوچھیے تو وہ اس سے زیادہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتے تھے۔ اُن کی اُفتادِ طبع اور اُس زمانے کی تہذیب کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ خاموشی سے کام کرتے رہیں اور زمانہ کی بے حسی سے زیادہ بددل نہ ہوں۔ بالآخر وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ

طے کر چکا ہوں راہِ محبت کے مرحلے
اس سے زیادہ حاجت شرح و بیاں نہیں

یہ شعر کہتے وقت ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوگا کہ جس راہِ محبت کے مراحل سے کامیاب گزر کر وہ اپنے تئیں مطمئن تھے اُس کی کامرانیوں اور دشواریوں کی داستان مدتوں محتاج بیان رہے گی اور بالآخر اس کی تشریح و بیان کا کام میرے نحیف و سبک مایہ قلم کو دیارِ غیر میں بیٹھ کر سرانجام دینا ہوگا۔ اس کام کی مشکلات کی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں ہے، البتہ اجمالی طور پر ان مسائل کا ذکر شاید بے محل نہ ہوگا جو اس سلسلہ میں مجھے پیش آئے۔

میں نے راز کی شاعری کے اس تعارفی مطالعہ کا بیشتر حصہ امریکہ کی سنگاخ سرزمین میں بیٹھ کر تالیف کیا ہے۔ امریکہ میں بڑی حد تک اردو شعر و ادب اور اس کے متعلقات ان مشاعروں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف شہروں میں منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ تنقید و تحقیق کے لیے جو وسائل ضروری ہیں، وہ یہاں کم و بیش مفقود ہیں۔ کتابیں، رسائل اور دوسرے مآخذ میسر نہیں ہیں اور ایسے اہلِ علم و بصیرت تقریباً ناپید ہیں جن سے تحقیق و تالیف کے گوناگوں اور مشکل مراحل میں راہ نمائی، مشورہ یا اصلاح کے لیے رجوع کیا جا سکے۔ اگر کہیں کوئی ایسا صاحبِ علم ہے بھی تو باہم ارتباط و مراسلت کے مواقع اور محرکات وہاں کی مخصوص مشینی زندگی کا شکار ہو کر مضمحل بلکہ مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ برصغیر ہند و پاک کے اُردو مراکز، وسائل اور اربابِ فکر و نظر سے دوری اور اہلِ اردو کی عمومی بے حسی بھی تخلیقی کوشش اور عمل میں سدِ راہ ہیں۔ ایسے دل شکن حالات پر مستزاد خود میری کوتاہیِ علم و ادبی سبک مائیگی ہر قدم پر میرا قلم تھام لیتی تھیں اور زیرِ نظر کتاب کی تدوین کا ہر مرحلہ نظر میں ناقابلِ تسخیر نظر آتا تھا۔

مندرجہ بالا مسائل اور موانع کے علاوہ میری مشکلات کا سب سے بڑا سبب وہ تعلق خاطر ثابت ہوا جو مجھ کو راز مرحوم سے ان کی زندگی بھر رہا اور میری زندگی ختم ہونے تک رہے گا۔

ابوالفاضل راز چاند پوری میرے مشفق و محترم والد ہی نہیں تھے، وہ میرے مربی، معلم، زندگی کے ہر نشیب و فراز میں راہ نما بلکہ یوں کہیے کہ میرے ہیرو تھے۔ اپنے ہوش سنبھالنے کے لمحہ سے اُن کی وفات تک میں نے ان کو، ان کے اندازِ فکر اور طریقِ عمل کو نہایت قریب سے دیکھا اور خود بھی اکثر و بیشتر اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ اب جب کہ میں خود زندگی کی پینسٹھ شامیں دیکھ چکا ہوں، یہ احساس اور بھی گہرا ہو گیا ہے کہ میری زندگی کے بیشتر اصول اور ضوابط، سوچنے اور کلام کرنے کا طریقہ اور حیات کا عمومی شعور انہیں کے فیضانِ صحبت و تربیت کے مرہونِ منت ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میں ان پر ایسے عمل نہیں کر سکا جیسا ان کا حق تھا۔ ایسے قریبی اور جذباتی تعلق کا ایک فطری تقاضا یہ بھی ظاہر ہوا کہ میں خود کو راز پر

CamScanner

ناقدانہ قلم اُٹھانے پر آمادہ نہ کر سکا۔ چنانچہ زیرِ نظر مطالعہ تعارفی ہے تنقیدی نہیں۔ کیونکہ یہ میرا مقام نہیں ہے۔

مذکورہ بالا مشکلات کے باوجود میں نے امکانی حد تک کوشش کی ہے کہ راز سے میری ارادت مندی، میری تجزیاتی فکر کو مطلوب نہ کر دے تاکہ میں ان کے کلام پر وہ صحیح و متوازن رائے پیش کر سکوں جس کے وہ مستحق ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب رہا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی اور شخص اس کام کو کرتا تو وہ بھی کم و بیش انہیں نتائج پر پہنچتا جو میرے مطالعہ اور تجزیہ سے ثابت ہوئے ہیں۔ اہلِ نظر کتاب کے مطالعے کے بعد خود یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک حقیقت حال سے قریب ہوں۔

بندۂ اہلِ محبت ہوں، صداقت کیش ہوں
ایک ہیں نا آشنا و آشنا میرے لیے

"باقیاتِ راز" کی تالیف و ترتیب کے حوالہ سے چند امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

راز کا وہ شعری سرمایہ جس کو خود ان کی نظر انتخاب و احتساب نے قابل اشاعت سمجھا، چالیس سالوں (1916ء تا 1955ء) پر محیط ہے اور تقریباً بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں کا ایک مختصر انتخاب "نوائے راز" (مطبوعہ 1961ء) اور نظموں کا ایک مجموعہ "دنیائے راز" (مطبوعہ 1930ء) اہلِ ذوق و نظر سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ برصغیر ہند و پاک کے مختلف رسائل و جرائد میں ان کا جو مزید کلام مدتوں شائع ہوتا رہا، اسے وہ اپنی مختلف مجبوریوں کی وجہ سے مرتب کر کے شائع نہیں کرا سکے۔ 1954ء میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے اپنے منتشر کلام کی شیرازہ بندی کی اور اس پر بالاستیعاب نظر ثانی کے بعد ایک ضخیم مجموعہ "مصحف راز" مرتب کیا جو تین حصوں پر مشتمل ہے:

(۱) "نوائے راز": جس میں ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ غزالیات ہیں۔

(۲) "صحیفۂ راز": جس میں ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ منظومات ہیں۔

(۳) "حدیث راز": جو ان کی غیر مطبوعہ رباعیات پر مشتمل ہے۔

اس منتخب کلام کے علاوہ راز نے اپنے بقیہ کلام کو جوان کے ابتدائی اور وسطی زمانۂ شعر گوئی کا نمائندہ نظرانداز ہی نہیں بلکہ یکسر تلف کر دیا۔ اس دور کی چند چیدہ چیدہ غزلوں کا انتخاب انہوں نے "مئے باقی" کے عنوان سے مرتب کر کے اپنے شعری اثاثہ میں محفوظ کر دیا تھا۔ یہی دونوں مسودات ("مصحف راز" اور "مئے باقی") زیرِ نظر تالیف کا موضوع ہیں۔

مرے کلام میں مضمر ہے زندگی اے راز
رموزِ حسن و محبت سے آشنا ہوں میں

1955ء کے بعد راز نے شعر گوئی تقریباً ترک کر دی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کے بقیہ چودہ سال گوشہ نشینی میں گزار دیے۔ ان کے ابتدائی اور وسطی دور کے کلام کے اتلاف اور آخر عمر میں دنیائے ادب سے کنارہ کشی سے اردو ادب و شعر کو جو نقصان پہنچا اس کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ شاعری سے آخر عمر میں مکمل دستبرداری کے بارے میں مصحف راز کے دیباچہ میں وہ یوں رقم طراز ہیں:

"آخر میں اس راز کو افشا کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ 55ء کے بعد راز کے حالات و خیالات میں کچھ ایسا انقلاب رونما ہوا کہ اس نے شعر گوئی ترک کر دی اور اگر کسی مجبوری کی بنا پر کبھی کچھ کہا بھی تو اس کو "مصحف راز" میں شامل نہیں کیا۔"

دراصل 1955ء میں راز کی اہلیہ نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا تھا اور اس صدمہ جانکاہ نے انہیں بالکل ہی مضمحل کر دیا تھا۔ اس سال کے بعد کی کہی ہوئی صرف تین غزلیں "مئے باقی" میں ملتی ہیں۔ ان تینوں کو میں نے والد مرحوم کی روح سے معذرت کے ساتھ اس کتاب میں شامل کرنے کی جسارت کی ہے کہ یہ بھی بہرکیف ان کے تبرکات میں سے ہیں۔ ان غزلوں پر میں نے تاریخ ڈال دی ہے تاکہ وہ بقیہ کلام سے ممیز رہ سکیں۔

اس تالیف کے آخر میں راز کے اُس کے کلام کا انتخاب شامل کر دیا گیا ہے جو "دنیائے راز" اور "نوائے راز" میں شائع نہیں ہوا تھا۔ ان کے غیر مطبوعہ کلام کو تمام و کمال شائع کرنا ممکن نہیں ہے۔ اُمید ہے کہ مذکورہ انتخاب ان کی شاعری کی نمائندگی بخوبی کر سکے گا۔ کسی کے کلام کا انتخاب نہایت ہی مشکل کام ہوتا ہے اور اس میں انتخاب کرنے والے کی پسند و ناپسند کا دخل ناگزیر ہے۔ راز سے میرے جذباتی تعلق کی وجہ سے یہ کام کچھ زیادہ ہی مشکل ثابت ہوا۔ بہرکیف اس سلسلہ میں اگر کوئی کوتاہی رہ گئی ہے تو میں اس کی ساری ذمہ داری قبول کرنے کو بخوشی تیار ہوں۔

مذکورہ بالا انتخاب میں "نوائے راز" اور دنیائے راز کی غزلوں اور منظومات میں سے وہ چند تخلیقات بھی شامل کر دی گئی ہیں جن سے کتاب کے متن میں مفصل استدلال کیا گیا ہے لیکن اختصار کے پیش نظر ہر وہ مطبوعہ تخلیق شامل نہیں کی گئی ہے جس کا کوئی شعر متن میں درج ہے۔ یہ اقدام قاری کے کلامِ راز کی بہتر تفہیم میں معاون ثابت ہوگا۔

اس کتاب کے آخر میں "مئے باقی" کے عنوان کے تحت راز کی اُن غزلیات کا انتخاب بھی ہے جن کو انہوں نے نظرانداز کر دیا تھا۔ گویا یہ خود ان کے انتخاب "مئے باقی" کا انتخاب ہے۔ اس سے نہ صرف اس بیش قیمت اثاثہ کی حفاظت مقصود ہے، بلکہ یہ خیال

CamScanner

بھی اس اقدام کا محرک ہے کہ ان اشعار سے مستقبل کے مورخ کو راز کی شاعری کی ارتقائی منزلوں کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکے گا۔ علاوہ ازیں اسی حصہ میں وہ پانچ نوحے بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو راز نے قریبی اعزہ اور احبا کی وفات پر نظم کیے تھے۔

میں معظمی مجید حامی صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے نہ صرف اس کتاب کی تدوین و تہذیب میں میری راہ نمائی کی، بلکہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس مسودہ پر نظر ثانی کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ محترمی سید الیاس صاحب نے کتاب کی تالیف کے مختلف مراحل میں اپنے مشوروں سے مجھے نوازا، میں ان کا بھی شکر گزار ہوں۔

آخر میں ضروری ہے کہ میں اپنی اہلیہ قیصر رازی کا شکریہ ادا کروں جنہوں نے اس مشکل کام میں قدم قدم پر میری ہمت افزائی کی اور وہ خوشگوار اور پرسکون ماحول بھی فراہم کیا جس کے بغیر میں اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکتا تھا۔

افسانہ بن نہ جائے کہیں بات راز کی
یوں مختصر حکایت ناز و نیاز کی

مجھے اپنے علمی اور ادبی فرومائیگی کا نہ صرف احساس ہے بلکہ اعتراف بھی۔ پھر بھی میں اس کتاب کی تالیف و اشاعت پر شرمندہ یا متاسف ہرگز نہیں ہوں، بلکہ اس کوشش پر مجھے دلی مسرت ہے۔ کچھ اس وجہ سے کہ میری یہ ناچیز تالیف راز کی شاعری کے مطالعہ اور تفہیم میں معاون ثابت ہوگی اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ یہ کتاب میری جانب سے اُن کی خدمت میں خراجِ عقیدت و محبت ہے کہ میں عمر بھر گلشن راز کا خوشہ چین رہا ہوں۔

حاصل عمر نثارِ رہِ یارے کردم
نازم از زندگی خویش کہ کارے کردم

✦✦✦

احمد ندیم رفیع/امریکا

غزل

جتنی باتیں بھی تم نے سمجھائیں
وہ مرے چارہ گر نے دہرائیں
مجھ سے بے ساختہ لپٹ سی گئی
تم سے پہلے تمہاری پرچھائیں
اب بھی راحت فزا ہیں وہ راہیں
تیرے انفاس نے جو مہکائیں
تیری زُلفیں سنور گئیں خود سے
میرے شانوں پہ جب بھی لہرائیں
ساری خوشیاں سمیٹ لیں میں نے
جو تمہاری ہنسی نے پھیلائیں
میرے حُسنِ خیال نے، مت پوچھ
تجھ کو کیا کیا قبائیں پہنائیں
کتنی معصوم خواہشیں تھیں جو
تیری خوش چشمگی نے بہکائیں
کتنی شب تاب تھیں وہ شامیں جو
تیری زلفِ سیہ نے چمکائیں
تیرے حُسن و سنگھار کی جہتیں
نظم و نسقِ بہار کہلائیں
تیرے پہلو میں آ کے بھی آنکھیں
جانے کیا بات ہے کہ بھر آئیں
آرزوئیں کبھی نہ ماند ہوئیں
آتشِ شوق نے جو بھڑکائیں
ایک دو گتھیاں تھیں ایسی بھی
میں نے کھولیں نہ تم نے سلجھائیں

✦✦✦

احمد ندیم رفیع/امریکا

ایک دُعا

اے مرے مالک! مجھے کربِ رسائی نہ دے
ذوقِ سفر دے مگر آبلہ پائی نہ دے
یا مری گویائی کو جرأتِ گفتار بخش
یا مرے انفاس کو نغمہ سرائی نہ دے
یا مرے سوزِ دروں سے مجھے آزاد کر
یا لبِ فریاد کو شعلہ نوائی نہ دے
یا مرے احساس کی کاٹ دے ساری رگیں
یا کسی خوش شکل کو دستِ حنائی نہ دے
علم و ہنر کے لئے، خام ہے میرا جنوں
درسِ خودی دے مگر دستِ گدائی نہ دے
ایسا نہ ہو زخم یہ، بھر نہ سکے پھر کبھی
ایک خطا پر ہمیں اتنی جدائی نہ دے
ایسے کسی وقت سے مجھ کو ہمیشہ بچا
سوچنا چاہوں مگر کچھ بھی سجھائی نہ دے
میری ہر اک چال پر تیری نظر ہے جہاں
ایسے قفس سے مجھے اذنِ رہائی نہ دے
سامنے رکھنا مرا نامۂ اعمال جب
اتنا کرم کیجیو، مجھ کو دکھائی نہ دے

قطعہ

ایک پیمانہ ہے بھر جاتا ہے رفتہ رفتہ
وقت کا کیا ہے گزر جاتا ہے رفتہ رفتہ
آؤ سب بھول کے تجدید محبت کر لیں
دل کا ہر میل اُتر جاتا ہے رفتہ رفتہ

✦✦✦

ڈاکٹر وحید الزماں طارق: ایک ہمہ جہت شخصیت کا زندہ حوالہ

علامہ عبدالستار عاصم/لاہور

ڈاکٹر وحید الزماں طارق سے تعلق محض تعارف یا عقیدت کا رشتہ نہیں، بلکہ یہ ایک قلبی واردات اور روحانی انسلاک کا نام ہے۔ ان کی شخصیت ایسی طلسماتی کشش رکھتی ہے کہ جو بھی ان کی قربت میں آتا ہے، اس کے دل و دماغ پر ایک ان مٹ نقش چھوڑ جاتی ہے۔

جب بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، ایسا محسوس ہوا جیسے علم و حکمت کے چشمے رواں دواں ہیں۔ ہر نشست ایک نادر موقع بن گئی کہ کچھ نیا سیکھا جائے، دل کی دنیا میں خوشی کی کونپلیں کھلیں اور روح تازگی اور سرشاری سے ہمکنار ہو۔ ان کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ گویا ایک قیمتی موتی ہے، جسے دل کے خزانے میں سنبھال کر رکھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں قلم اٹھاتے ہوئے عجب سی طمانیت دل و جاں کو گھیر لیتی ہے۔ ایک غیر معمولی شخصیت کا تذکرہ کرنا کسی سعادت سے کم نہیں، کیونکہ وہ صرف اپنے نام کی خوشبو ہی نہیں رکھتے، بلکہ جن جن شعبوں سے وابستہ رہے، ان میں اپنے خلوص، دیانت اور قابلیت کی ایسی خوشبو بکھیر دی کہ وہ میدان نیک نامی سے معطر ہو گئے۔

چاہے فوج کا میدان کارزار ہو، طب کا شعبہ ہو یا ادب کا وسیع افق، ڈاکٹر وحید الزماں طارق نے ہر جگہ اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا۔ وہ ایک ایسے درویش صفت سپاہی ہیں جو دل میں قوم کا درد، ہاتھ میں علم کا چراغ، اور زبان پر حکمت کے موتی سجائے ہوئے ہیں۔

ان کی زندگی کا سفر ایک ایسے چراغ کی مانند ہے، جو اندھیروں میں جل کر نہ صرف خود روشن ہوتا ہے بلکہ اپنے گرد و نواح کو بھی نور بخشتا ہے۔ وہ گوجرانوالہ کے ایک نہایت چھوٹے اور سادہ سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایک عام سرکاری اسکول سے حاصل کی، مگر فطرت نے اُن کے دامن میں جو قابلیت اور بصیرت کے خزانے رکھے تھے، وہ بچپن ہی سے نمایاں ہونے لگے۔

جو کہا جاتا ہے کہ ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' تو ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی کامیابیاں اسی کہاوت کی عملی تفسیر بن گئیں۔ میٹرک کے امتحان میں طلائی تمغہ حاصل کرنا اور قومی ذہانت کے وظیفے سے نوازا جانا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قدرت نے اُنہیں عظمت کے راستوں پر گامزن کرنے کا فیصلہ پہلے ہی صادر فرما دیا تھا۔

یہ محض آغاز تھا، آگے چل کر اُنہوں نے علمی فتوحات کا وہ سلسلہ شروع کیا جو انتہائی قابل رشک ہے۔ ایم بی بی ایس کی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایف آر سی ایس جیسا قابلِ فخر اعزاز بھی اُن کی جھولی میں آیا۔ پھر تو علم کے یہ دریا اس طرح بہنے لگے کہ اُنہوں نے دنیا کی کئی نامور یونیورسٹیوں میں نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ تحقیق و تدریس کے منصب پر بھی فائز رہے۔

اپنی فطری تشنگی علم کے پیشِ نظر اُنہوں نے طب و سائنس کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کی وادیوں میں بھی قدم رکھا۔ فارسی و عربی سے اُنہیں لڑکپن ہی سے خاص شغف تھا، چنانچہ فارسی زبان میں ماسٹرز کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کی معراج بھی حاصل کی۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ طب اور سائنس کی دنیا اور فارسی شعر و ادب کی بزم دو الگ الگ اور متضاد علمی کہکشائیں ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف ان دونوں کہکشاؤں پر قدم رکھا بلکہ اُنہیں اپنے علم و تحقیق کے نکھار سے روشن کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے 1980ء میں کمیشن حاصل کیا۔ 1986ء میں پاک آرمی میں میجر کے عہدے پر فائز ہوئے، جبکہ 1993ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک ترقی پائی۔ بعد ازاں 1996ء میں کرنل بنے اور 2002ء میں انہیں بریگیڈیئر کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ وہ پاک فوج سے بطور بریگیڈیئر ریٹائر ہوئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد، وہ متحدہ عرب امارات کے شہر العین میں ایک معروف ہسپتال میں 12 برس تک بطور ڈاکٹر اپنی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ زندگی بھر اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

وہ ہمہ گیر فکری جہان کا روشن مینار ہیں۔ ان کا نام جب لیا جاتا ہے تو ذہن میں سب سے پہلا حوالہ اقبال شناسی اور فارسی زبان میں ان کی غیر معمولی دسترس کا ابھرتا ہے۔ ان کا مطالعۂ اقبال اتنا عمیق اور ان کی فارسی دانی اتنی رواں ہے کہ وہ اقبال کے افکار و فلسفہ کو صرف سمجھتے نہیں، بلکہ اس کا روحانی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ اقبال کی نظموں کی تہہ داری اور ان کے فلسفے کا جو طلسم ڈاکٹر صاحب کے قلب و دماغ میں کھلتا ہے، وہ عام قاری کی رسائی سے بہت بلند ہے۔

شاعرِ مشرق حضرت علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کی فکر انگیز شاعری اور ان کے گہرے فلسفیانہ نظریات کا عرفان ہر کس و ناکس کے نصیب میں کہاں! یہ سعادت

معدودے چند صاحبان دانش کو میسر آتی ہے

میری دانست میں یہ منصب انہیں فطرت کی طرف سے عطا کردہ تھا، کیونکہ جس انداز سے وہ فکرِ اقبال کے نکتے سمجھاتے ہیں اور اس کے گہرے اسرار ورموز کو اجاگر کرتے ہیں، وہ محض علمی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک روحانی عنایت کا عکس ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف اور تحقیقی مقالات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اُن کی نگارشات صرف اقبالیات تک محدود نہیں بلکہ فارسی اور اردو شاعری کے میدان میں بھی اُنہوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اُن کے شعری مجموعے ہمارے لیے کسی گراں بہا ارمغان سے کم نہیں۔ یہ تخلیقات نہ صرف علم وادب کے متوالوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں بلکہ نئی نسل کے لیے فکری تربیت کا سرچشمہ بھی ہیں

انہوں نے حضرت علامہ اقبالؒ کی حیاتِ فکر وفن کا نہایت باریک بینی اور عرق ریزی سے مطالعہ کیا ہے۔ چونکہ اقبالؒ کا بیشتر کلام فارسی زبان میں ہے، اور اُن کے افکار کی گہرائی تک رسائی کیلئے فارسی پر عبور ناگزیر ہے، سو ڈاکٹر صاحب نے فارسی زبان میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر کے اپنے شوقِ تحقیق کو عملی صورت عطا کی۔

علامہ اقبال جیسی عبقری ہستی کو پیشوا و راہنما ماننا دراصل حکمت وعرفان کے اُس سرچشمے سے وابستگی کا اظہار ہے، جو قلب وروح کی ویرانیوں کو گلزار بنا دیتا ہے۔ یہی نسبت اگر کسی شخص کو حاصل ہو جائے تو وہ اپنے وقت کا "وحید العصر" بن جاتا ہے۔ یہی مقام ان کا ہے، جن کے فیوض وبرکات نہایت یکتا ومنفرد ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر وحید الزمان طارق کے علمی فیضان کی روشن مثالیں چغتائی ریسرچ سنٹر کے اُس آڈیٹوریم میں دیے جانے والے وہ خطبات ہیں، جہاں وہ فکرِ اقبال کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے حاضرین کے دلوں اور اذہان میں اٹھنے والے سوالات اور پیچیدہ علمی مغالطے نہایت سہولت سے، گویا پلک جھپکنے میں رفع فرما دیتے ہیں۔

ان کے خطبات کی گونج محض وطنِ عزیز کی حدود تک محدود نہیں رہی، بلکہ ان کا اثر ورسوخ عالمگیر بن چکا ہے۔ اب اُنہیں تسلسل کے ساتھ یورپ، امریکہ، برطانیہ، مشرقِ وسطیٰ اور دنیا کے دیگر ممالک کی ممتاز جامعات اور علمی اداروں میں مدعو کیا جاتا ہے، جہاں وہ فکرِ اقبال کی گہرائیوں اور معانی کے دریچے وا کر کے عالمِ علم وعرفان کو منور کرتے ہیں۔

لیکن یہ تعارف صرف ان کی شخصیت کا ایک پہلو ہے درحقیقت، وہ ایک کثیر الجہات انسان ہیں، ایک جہانِ معنی جو کئی جہانوں پر محیط ہے۔

وہ صرف شاعر نہیں، سخن فہم بھی ہیں؛ صرف نثر نگار نہیں، نثر کے سحر کو کہانی کی لذت میں ڈھالنے والے ماہر فنکار ہیں۔ ان کا اسلوبِ تحریر ایسا دلنشین ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے گویا الفاظ سانس لے رہے ہوں، اور تحریر کے جملے کسی داستان گو کی طرح گوش گزار ہو رہے ہوں۔ ان کی تحریروں میں ایک فطری روانی ہے، جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، اور اسے فکری دنیا کے ایک نئے منظرنامے سے آشنا کرتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ صرف الفاظ کے کھلاڑی نہیں، بلکہ تجربات کے امین ہیں۔

بطور ایک سرکاری اور شخصی حیثیت کے، انہوں نے دنیا کے متعدد ممالک کی خاک چھانی ہے۔ ہر سرزمین سے انہوں نے علم کے موتی چنے، ہر تہذیب سے کچھ نہ کچھ اخذ کیا اور ہر مجلس سے دانائی کا چراغ روشن کیا۔ ان کے مشاہدات میں بین الاقوامی ثقافتوں کی رنگارنگی ہے، اور ان کی تحریروں میں وہ بصیرت جھلکتی ہے جو صرف سفر کے تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔

ان کے قلم کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ خشک علمی مباحث کو بھی اس دلآویز انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری بوریت محسوس نہیں کرتا، بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی داستان گو، ماضی کی مجلسوں میں بیٹھا دلکش حکایات سنا رہا ہو۔ ان کی نثر میں شعریت کی لطافت ہے اور ان کی نظم میں فکری گہرائی، یوں گویا ان کے قلم نے دونوں جہانوں کو اپنے سحر میں باندھ رکھا ہے۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ڈاکٹر وحید الزماں طارق علم وادب کے قافلے کے وہ سالار ہیں جنہوں نے اپنی بصیرت سے کئی قلوب کو منور کیا، کئی اذہان کو بیدار کیا، اور فکری افق پر روشنی کی ایسی کرنیں بکھیریں جو رہروانِ علم وحکمت کے لیے مینارۂ نور بن گئیں۔

ان کے فکری سرمائے میں جہاں روایت کی جمالیات ہے، وہیں جدت کا شعور بھی نمایاں ہے۔ وہ ماضی کی عظمتوں کے امین ہیں تو حال کی پیچیدگیوں کے نباض بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں صرف کتابوں کے اوراق تک محدود نہیں رہتیں بلکہ قاری کے قلب وذہن میں مستقل جا بسنے والی آواز بن جاتی ہیں

ڈاکٹر وحید الزمان طارق کا اردو شعری مجموعہ زمزمۂ احوال محض شعری اظہار کا مجموعہ نہیں بلکہ اُن کے قلب وروح کی جھلک ہے، جس میں اُنہوں نے نہ صرف شخصیات کے تذکرے کو محبت اور عقیدت سے سنوارا ہے بلکہ اپنے محبوب شہروں کا ذکر بھی اس درجہ والہانہ انداز میں کیا ہے کہ قاری خود کو اُن بستیوں کی

گلیوں میں محسوس کرنے لگتا ہے۔

خصوصاً لاہور، جو اُن کے خوابوں کا شہر، اُن کی جوانی کا گہوارہ اور اُن کی ادبی تربیت کی آماجگاہ رہا، اس کا ذکر جس جذباتی وابستگی کے ساتھ کیا گیا ہے، وہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے ایک لطیف مگر روشن پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ اُن کی نظم لاہور میں وہ عشق کی حدوں کو چھوتی محبت نظر آتی ہے، جو اپنے شہر کے کوچہ و بازار سے ایک زندہ تعلق کا پتہ دیتی ہے:

''جہاں کے کوچہ و بازار رستے
ہیں پر رونق وہ ہنستے اور بستے
جوانی کی مری معصوم یادیں
مرے جذبات کی موہوم یادیں
اسی گلشن سے وابستہ رہی ہیں
وہاں سو داستانیں ان کہی ہیں''

یہ اشعار صرف یادوں کی مالا نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیبی منظر نامہ ہے، جس میں لاہور کے رنگ، خوشبو، اور اُس کی علمی فضا ایک ہمہ گیر جذبے کے ساتھ سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔

ان کی اردو شاعری پر فارسی شاعری کے اثرات نمایاں ہیں۔ خود فرماتے ہیں

طارق سخن میں بیدل و غالب کا ہوں مرید
شیراز کے ہے رنگ میں اسلوب دہلوی

ڈاکٹر وحید الزمان طارق کی نثر بھی اُن کی شاعری کی طرح سحر انگیز ہے۔ اُن کی تحریریں محض واقعات کا بیان نہیں بلکہ فکری بالیدگی کا مظہر ہیں۔ عسکری ادبی روایت میں جن فوجی افسران نے اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے دوران گراں قدر نثری شہ پارے تخلیق کیے، ڈاکٹر وحید کی نثر اُنہی کی روایت کی ایک حسین کڑی ہے۔ ان کے مضامین، تجزیے، اور تحقیقی مقالات ایسے ہیں کہ جنہیں آنے والے دنوں میں ہماری اعلیٰ درسی کتب کا حصہ بننے کا شرف حاصل ہوگا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی علمی کاوشوں کو اس مقام تک پہنچنے میں زیادہ وقت درکار نہیں رہا۔ ان کی فارسی شاعری کو تو پہلے ہی یہ اعزاز نصیب ہو چکا ہے۔ اُن کی فارسی نظموں کو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ فارسی نے اپنے نصاب میں شامل کر کے اُن کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ یہ صرف ڈاکٹر صاحب کے لیے ہی نہیں بلکہ اردو اور فارسی ادب کے لیے بھی ایک فخر کی بات ہے کہ ہمارے عہد میں ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت موجود ہے جو بیک وقت علم، تحقیق، شاعری، اور فکری بلند نگاہی کا استعارہ بن چکی ہے۔

ڈاکٹر عرفانی کو کون نہیں جانتا۔ ڈاکٹر عرفانی کا خاندانِ اقبال سے قریبی تعلق محض ایک نسبتِ رسمی نہیں، بلکہ فکری و روحانی رشتہ بھی تھا۔ یہی نسبت ڈاکٹر وحید الزمان طارق کی عرفانی صاحب کے ساتھ بھی ایک گہرا تعلق رکھتی ہے۔ وہ نہ صرف ڈاکٹر عرفانی کے چہیتے تھے بلکہ قرابت داری کا رشتہ بھی ان دونوں کے درمیان حائل نہ تھا۔

وہ فرماتے ہیں کہ وہ آج بھی اپنے علمی سفر میں انہی کے نقشِ پا پر گامزن ہیں، اور اپنے لیے راہنمائی انہی کے چھوڑے ہوئے چراغوں سے پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر عرفانی کے وہ اشعار، جو گویا ایک علمی ورثے کے طور پر اُنہیں عطا ہوئے، ڈاکٹر وحید الزمان طارق کے لیے سرمایۂ افتخار بن گئے ہیں۔ ان اشعار کو وہ نہ صرف دل سے لگائے ہوئے ہیں بلکہ اپنی علمی حیات کا نشانِ راہ سمجھتے ہیں:

ای پسرا اعصاب من برہم شدست
قوت فکر و تخیل کم شدست
دل نمی میرد دگر از مرگِ تن
تو مرا دل باش ای فرزندِ من

(اے میرے بیٹے! میری قوتِ اعصاب کمزور ہو چکی ہے)
فکر و تخیل کی توانائی بھی ماند پڑ گئی ہے۔
لیکن جان لو! دل کبھی جسمانی موت سے نہیں مرتا،
(بس تو میرا دل بن جا، اے میرے فرزندِ عزیز!

یہ اشعار صرف چند مصرعے نہیں، بلکہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہونے والی فکری مشعل ہیں۔ ان میں ڈاکٹر عرفانی کی فکر کی گہرائی اور اپنے عزیز شاگرد و فرزندِ معنوی کے لیے بے پایاں محبت جھلکتی ہے۔ گویا ایک روح نے دوسری روح میں اپنی روشنی منتقل کر دی ہو، تاکہ چراغِ علم و حکمت ہمیشہ روشن رہے۔

ڈاکٹر وحید الزمان طارق ایک ایسا چراغ ہیں جو خود جل کر دوسروں کو روشنی عطا کرتا ہے۔ ان کے فکر کی روشنی دور دور تک پھیلتی ہے اور نہ جانے کتنے تشنہ دل اس سے سیراب ہو رہے ہیں۔ ان کا وجود اپنے اندر علم، تجربے اور روحانیت کی ایک مکمل دنیا سموئے ہوئے ہے۔ ایسے لوگ کم ہی پیدا ہوتے ہیں، جو اپنے عمل اور کردار سے اپنے عہد کا حوالہ بن جائیں۔

یقیناً، ڈاکٹر صاحب جیسے لوگ معاشرے کے لیے نعمت خداوندی ہوتے ہیں۔ ان کا ذکر کرنا صرف تحریر کا حق ادا کرنا نہیں، بلکہ ان کا حق محبت بھی ہے۔ ان جیسی شخصیات پر جتنا بھی لکھا جائے، کم ہے، کیونکہ ان کی عظمت کے آسمان کی کوئی حد نہیں، اور ان کے کمالات کا احاطہ کرنا الفاظ کی محدود دنیا سے ماورا ہے۔

راجا مظفر حسن منصور...... شخصیت و ادبی خدمات!

راجا غلام اصغر طاہر/ جوہر آباد خوشاب

نامور لوگوں میں سے ایک بڑا نام مردِ قلندر فرزندِ خوشاب، جناب مظفر حسن منصور کا ہے۔ راجا صاحب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا کام صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ گریجوایٹ کالج جوہر آباد اور اُن کے رفقاء کے حصے میں آیا ہے۔ آپ احباب یقیناً لائق صد تحسین اور مبارک باد کے قابل ہیں۔

ناصر، فیض، فراق ہمارے مایہ ناز سخنور ہیں
تنہائی میں اُن کو سوچا، محفل محفل یاد کیا
عدم، شکیب، جلیل، نظامی، جالب، شہزاد اور منصور
کتنے جواہر جمع کیے تو جوہر آباد کیا

مظفر حسن منصور ۲۶ نومبر ۱۹۴۱ء کو سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ مظفر حسن منصور کا تعلق ایک نہایت معتبر علمی و ادبی خانوادے سے تھا۔ گھر کی محفلوں میں انیس، دبیر کے مرثیے اور گلستان و بوستان جیسی کتب پڑھی جاتی تھیں۔ اس ماحول نے اُن کی فطری صلاحیتوں میں نکھار پیدا کیا۔ والد گرامی حضرت جوہر نظامی ایک قادر الکلام شاعر اور اپنے دور کی نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ اپنے والد کی گہری چھاپ اُن میں دیکھی جا سکتی ہے۔ والد صاحب کے شاعر ہونے کے باعث گھر پر اکثر و بیشتر ادبی محافل ہوتی رہتی تھیں۔ جسکی وجہ سے علم و ادب خصوصاً اُردو شاعری سے گہرا شغف اور شعر فہمی بچوں کے مزاج کا حصہ بن گئی اور دلچسپ بات یہ ہے کہ منصور سمیت چار بھائی صاحب دیوان شاعر ہیں۔ علمی و ادبی خانوادے سے تعلق کے باعث ادب شناسی اُن کے خون میں شامل تھی۔

مظفر حسن منصور نے حالات کی مجبوری کے تحت ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد جنوری ۱۹۶۳ء میں AGPR سے بطور کلرک ملازمت کا آغاز کیا۔ ملازمت کے دوران BA اور MA کے امتحانات پاس کیے۔ بعد ازاں محکمہ تعلیم میں ۱۹۷۶ء میں اُردو کے لیکچرر منتخب ہوئے۔ اور یکم اپریل ۲۰۰۲ء کو اسسٹنٹ پروفیسر اُردو ساٹھ سال کی عمر میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ بطور استاد مظفر حسن منصور نے اپنی ملازمت کا زیادہ تر حصہ گورنمنٹ کالج جوہر آباد میں گزارا۔ ملازمت کے دوران ہی فریضہ حج بھی ادا کیا۔ علم و ادب سے لگاؤ کے باعث شعبہ تعلیم اُن کے لیے نہایت موزوں تھا۔ اس ماحول میں انھیں اپنی شعری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے اور نکھارنے کا بھرپور موقع ملا۔

راجا صاحب ۱۹۶۹ء میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوئے۔ اہلیہ سادہ دل اور قناعت پسند خاتون تھیں۔ جنھوں نے محدود ذرائع میں بچوں کی بہترین تربیت کی۔ وہ شعر و ادب سے بھی دلچسپی رکھتی تھیں اور راجا صاحب کی مذہبی شاعری کی قدر دان تھیں۔ مظفر حسن منصور اولاد کے حوالہ سے نہایت خوش قسمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں نہایت سعادت مند اولاد سے نوازا۔ تین بیٹے سی ایس پی آفیسر جبکہ ایک بنکار اور بڑا بیٹا ایف بی آر میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہے۔ تمام بچے شعر و سخن سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ راجا صاحب کی حیات میں جب کبھی تمام بچے اکٹھے ہو جاتے تو کئی کئی گھنٹوں شعر و سخن کی محفل بجتی۔ اور بیت بازی کے ایسے ایسے مقابلے جمتے کہ الاماں الحفیظ۔۔۔ بطور باپ نہایت

شفیق، ہمدرد اور مہربان انسان تھے۔ مظفر حسن منصور ایک Selfmade انسان تھے۔ تمام عمر جدوجہد میں گزاری۔ راجا صاحب کی اخلاقی و مالی مدد کی وجہ سے ہی اُن کے چھوٹے بھائی اپنی تعلیم مکمل کر پائے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی انھوں نے مصروف زندگی گزاری۔ بزم جوہر کی محافل کی زینت بنے رہے۔ ضلعی امن کمیٹی اور ڈویژنل امن کمیٹی کے ممبر جبکہ انجمن حسینیہ جوہر آباد کے تاحیات صدر رہے۔ عزاداری سید الشہدا حضرت امام حسینؑ کی مجالس کے اہتمام اور جلوسوں کے انعقاد کے روحِ رواں تھے۔ نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط اُن کی زندگی کے نہایت لطیف احساس میں مذہبی رواداری اور اتحاد بین المسلمین کی فضا ہمیشہ قائم رہی۔ انھوں نے زندگی میں حوصلہ، برداشت کا درس محبت رسولؐ و آل رسولؐ سے لیا تھا۔ بچپن ہی سے مصائب اہل بیتؑ سے واقفیت نے زندگی کے مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔

محدود وسائل کے باوجود نایاب و تاریخی کتب و رسائل و جرائد خریدتے۔ خود بھی پڑھتے اور ہمیں بھی پڑھنے کا شوق دلاتے۔ مذہب سے لگاؤ اور شعر و ادب سے رغبت نے انھیں حصول علم اور زندگی میں کامیابی دلائی اور شعر و ادب اُن کے اظہار کا ذریعہ بنا۔ آٹھویں جماعت سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ مظفر حسن منصور ایک ترقی پسند انسان اور شاعر کی حیثیت سے حالات و واقعات سے جنم لینے والے دکھوں کا گہرا اثر لیتے۔ اُن کی شاعری میں مسکراہٹ میں چھپا ہوا طنز صاف نظر آتا ہے۔ مظفر حسن منصور کی

CamScanner

فریاد ہر رنگ میں اُن کے لب پر آتی رہی ۔اُن کی غزلیں، نظمیں اور رباعیات اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ فن شاعری پر مکمل عبور رکھتے تھے ۔وہ مروج رنگ میں ترقی پسند نہیں تھے تاہم معاشرے میں مثبت اقدار کے فروغ کے حامی اور ظلم و جبر کے ہر رویے کے خلاف تھے ۔اپنی عمر کی سات دھائیاں دیکھنے کے بعد ۲۰۱۵ء میں اُن کی پہلی کتاب ''اِک دورِ محبت بیت گیا'' منظرِ عام پر آئی ۔مجموعے کی اس قدر تاخیر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مظفر حسن منصور کے پیش نظر شاعری نہ تو وجہ شہرت تھی اور نہ ہی وسیلہ معاش ۔۔۔بلکہ وہ اپنی ذات کی تسکین یا اندر کے کسی خلاء کو پُر کرنے کے لیے شعر کہتے تھے ۔اُن کی شاعری ہماری کلاسیکی روایت کا عمدہ نمونہ ہے۔

مظفر حسن منصور نے جیسے نوآموز شاعر نے مشقِ سخن کی ابتدا کی تو اس وقت ناصر کاظمی ،گوہر ہوشیار پوری، ظفر اقبال ،انور شعور، اطہر نفیس اور رضی اختر شوقِ ادب کے حلقوں میں مقبول تھے ۔کم عمری ہی میں جن اہم ادبی شخصیات سے اُن کا تعارف ہوا اُن میں الطاف مشہدی ،عبدالحمید عدم ،انور گوئندی ،رشک ترابی اور اظہر جاوید کے نام نامی شامل ہیں۔ مظفر حسن منصور کے ہم عصروں میں اُن کے بھائی حسن اختر جلیل کے ساتھ ساتھ احمد مشتاق ،شہزاد احمد شہزاد ،شکیب جلالی اور عبیداللہ علیم جیسے شعرا شامل تھے۔ منصور نے اپنے مجموعہ کلام میں اُن تمام موضوعات پر اظہارِ خیال کیا جو کلاسیکی عہد سے لے کر دورِ جدید تک غزل کا موضوع رہے ہیں ۔انھوں نے کلاسیکی اور رومانوی طرزِ احساس میں ایک نقطہ اتصال دریافت کیا جو بہت کم شعرا کی گرفت میں آتا ہے ۔اُن کے شعری موضوعات میں عشق و محبت ،انا اور خودداری ،رجائیت ،جدید حسیت ،احساسِ تنہائی ،فکری و فلسفیانہ عناصر ،سادگی ،اختصار ،تازہ کاری ،دردمندی ،پرتاثیر لب و لہجہ ،خوبصورت تشبیہات ،استعارے ،علامتیں اور تمثالیں نظر آتی ہیں ۔مظفر حسن منصور کی پہچان بطور غزل گو شاعر کے ہی ہے مگر انھوں نے نظمیں بھی لکھیں ۔اس کے علاوہ رباعیات و قطعات بھی اُن کی شاعری کا حصہ ہیں ۔رثائی ادب (حمد ،نعت ،سلام ،قصیدہ ،منقبت ،مرثیہ) کے حوالہ سے ایک بڑا علمی خزانہ غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ منصور نے شاعری کی ہر ہیئت کو اپنے جذبات کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔غزل میں باوقعت اور قابل قدر سرمایہ اُردو ادب کو فراہم کیا ہے جبکہ نظم میں بھی ہر موضوع اور انداز میں شاعری کی ہے ۔مظفر حسن منصور کا کلام دلوں کو چھو لینے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ایک خوشگوار اور بھر پور اثر اپنے قاری پر چھوڑتے ہیں ۔اُن کے ہاں تازگی فکر اور اسلوب کی ندرت ہے ۔اچھے شعر ستاروں کی طرح چمکتے ہیں اور پڑھنے والے کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اُن کی روشنی کو اپنے قلب و ذہن میں اُتار کر زندگی میں انھیں اپنا رفیق بنا لے۔

وفات سے چند دن قبل راجا صاحب کی زبان پر اکثر یہ شعر جاری رہتا تھا۔

تنہائیوں کی گونج ہے تنہا نہیں ہوں مَیں
صحرا یہ کہہ رہا ہے اکیلا نہیں ہوں میں

اُردو ادب کا یہ چمکتا ہوا ستارہ بالآخر ۲ ستمبر ۲۰۲۴ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملا ۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے ۔(آمین)

آصف ثاقب / بوئی ہزارہ

غزل

اندھیروں کے سفر میں ہیں وفائیں روشنی کی
ہمارے حق میں ہوتی ہیں دُعائیں روشنی کی

اندھیرے جتنے بھی پردے گرائیں یہ نگاہیں
ہمیشہ سامنے رکھیں فضائیں روشنی کی

ابھی آئے ابھی جائے ہمیں حیران کر کے
بہت جھیلی گئی ہیں یہ سزائیں روشنی کی

یہاں تاریکیاں بھر لیں اُڑانیں جتنی چاہیں
اُڑی جائیں گی ہر سو فاختائیں روشنی کی

ہماری نیند کے جھونکوں سے اتنی ہے قرابت
سنہرے خواب ہی صورت دکھائیں روشنی کی

اندھیرے جس طرف بھی پیاس کے شعلے اُٹھائیں
وہاں دیں گی شہادت کربلائیں روشنی کی

یہ آنسو اور سپنے پھر ہتھیلی کے کرشمے
ہمارے گھر میں ہوتی ہیں انائیں روشنی کی

✦✦✦

زبان وادب کے فروغ میں صحافت کا کردار

ثوبیہ شاہ/فیصل آباد

صحافت اور زبان وادب دونوں کی دنیا الگ ہے اور دونوں کا میدان بھی جدا ہے، اس کے باوجود یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور بعض اوقات دونوں میں دوریاں برقرار رہتی ہیں۔اس لئے ان دونوں کے رشتوں پر دو نہج سے بحث کی جاسکتی ہے۔متعلقہ میدانوں سے وابستہ شخصیات کا مطالعہ اور ان کی تخلیقات یا نگارشات کا تنقیدی جائزہ اس بحث کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

1۔صحافت کی تعریف

صحافت لفظ محدث یعنی نئے دور کا ایجاد کردہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس لفظ کا استعمال قدیم عربی زبان میں نہیں ملتا اور نہ ہی لغت کی قدیم کتابوں میں اس کا تذکرہ وتشریح ملتی ہے، ہاں اس سے متعارف کئ الفاظ ضرور ملتے ہیں، مثلاً صحیفہ، صحف، صحی، تصحیف اور مصحف وغیرہ۔ان میں سے جو لفظ صحافت کے قریب ترین معنی پر دلالت کرتا ہے، وہ ہے"صحیفہ"۔

شیخ نجیب الحداد نے سب سے پہلے اس لفظ کو موجودگی اصطلاحی مفہوم میں استعمال کیا تھا اور اس کی تعریف میں لکھا تھا کہ"صحافت"صحف کی صفت کو کہتے ہیں اور صحف صحیفہ کی جمع ہے جس کے معنی لکھے ہوئے کاغذ کے ہوتے ہیں اور صحافی کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے۔جو اس کی صنعت کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور اس کے پیشے کو اختیار کرتے ہیں۔"پرچہ نکالنے کی صنعت کو صحافت کہا جاتا ہے"۔

شیخ رضاء اللہ محمد ادریس اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"عربی استعمالات کے اعتبار سے صحافت اس وقت عام طور پر دو معنوں میں مستعمل ہے۔ایک کا دائرہ محدود اور دوسرے کا وسیع۔ایک کا معنی وہ ہے جو انگریزی لفظ جرنلزم کے مقابلہ میں ہے یعنی جملہ ذرائع ابلاغ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔دوسرا معنی وہ ہے۔ جو انگریزی کے لفظ پریس (press) کے مقابلے میں ذرائع ابلاغ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور شائد اردو زبان بھی بعینہ یہی استعمالات پائے جاتے ہیں۔صحافت سے ہماری مراد وہی صحافت ہے جو جرنلزم کے معنی میں مستعمل ہے۔"

1۔صفحہ نمبر 29

2۔صحافت کی اہمیت وافادیت

صحافت بھی اعلام کا ایک وسیلہ ہے اور تمام اقوام عالم میں بہت مقبول اور اہم ذریعہ ہے۔ہر قوم اور انسانی معاشرہ اپنے دینی عقائد، فکری رجحانات، سیاسی نظام، اقتصادی نظریہ اور اجتماعی ماحول کی بنیاد پر اپنے رنگ میں وسائل اعلام اور صحافت کو استعمال کرتا ہے۔

موجودہ دور میں یوں تو جملہ ذرائع ابلاغ اور وسائل اعلام حد درجہ اہمیت کے حامل ہیں اور نئی نئی ایجادات وانکشافات اور جدید ٹیکنالوجی نے ان کو ترقی کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا ہے ان تمام کے باوجود رسائل وجرائد اور اخبارات کی صحافت کو جو غیر معمولی مقام واہمیت حاصل ہے وہ دیگر ذرائع ابلاغ کو حاصل نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ نسبتاً قدیم ہونے کے باوجود صحافت بڑی حد تک اپنے روایتی انداز میں جاری و ساری ہے۔جدید ٹیکنالوجی اور سہولیات سے اس نے بھی استفادہ ضرور کیا ہے اور اپنے اندر کافی تبدیلی پیدا کر لی ہے۔صحافت دراصل ایک ایسا نسخہ کیمیا ہے جس کے ذریعہ مختلف کام بہ آسانی کئے جاسکتے ہیں۔کسی غیر اہم اور معمولی سے معمولی مسئلے کو بھی اہم اور غیر معمولی بنا کر لوگوں کی توجہ اس کی جانب صحافت کے ذریعہ مبذول کرائی جاسکتی ہے۔اس کے اندر تاثیر کی غیر معمولی قوت اور جزبات سے کھیلنے کی اچھی اور بھرپور صلاحیت ہوتی ہے۔1869ء میں یورپ کے مشہور شہر پراگ کے اندر یہودی حاخام راستوروں نے اپنی ایک تقریر کے دوران یہودی لابی کو پرنٹ صحافت پر اکساتے ہوئے کہا تھا کہ اگر پوری دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے ہم سونا کو اپنی اولین طاقت قرار دیتے ہیں تو صحافت کو ہمیں دوسری طاقت سمجھنا چاہیے۔

کونا بلیون نے اپنے الفاظ میں واضح کیا ہے:

"میں توپ خانوں کی گھن گرج کی بہ نسبت قلموں کی سرسراہٹ سے زیادہ خوف کھاتا ہوں۔"

2صفحہ نمبر 36

اس لیے یہ بھی کہا گیا ہے۔ایسی قوم جو آزاد اور مستقل صحافت کے سایہ میں زندگی گزار رہی ہو، کبھی بھی اس پر کوئی ظالم حکومت نہیں مسلط رہ سکتی چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے لیے یہ ایک منبر کی حیثیت رکھتی ہے جہاں سے وہ اپنی آواز کو بلند کر سکتے ہیں۔یا اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کر سکتے ہیں ۔اس کے توسط سے معاشرہ کے عمومی مسائل یا مختلف نظریات پر کھل کر نقاش اور بحث ومباحثہ ہو سکتا ہے۔

3۔صحافت کا تاریخی پس منظر

صحافت ایک فن ہے جو زمانہ قدیم سے ہی کسی نہ کسی شکل میں انسانی معاشرے کا حصہ رہا۔قیصر روم جولیوس اپنے زمانہ بلٹین کی شکل میں ایک اعلامیہ شائع کرتا تھا اور اسے عمومی جگہوں پر چسپاں کر دیتا تھا جس

میں لوگوں کو باخبر رکھنے کے لیے حکومت سے متعلق خبریں ہوا کرتی تھیں ۔ سب سے قدیم ترین اخبار چین کے دارالحکومت پیکنگ (بیجنگ) سے آٹھویں صدی میں شائع ہوا تھا۔ پندرھویں صدی میں بھی جرمنی کے مختلف شہروں سے کئی اخبارات شائع ہوئے تھے۔ برطانیہ میں سب سے پہلے 1622 عیسوی ویکلی نیوز نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس طرح اٹھارہویں صدی سے پہلے بھی بعض صحافتی مجہودات کا ذکر ملتا ہے۔ کتب صحافت کے مطالعہ سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ مصر پر نابلیون کے حملے کے ساتھ عالم عرب میں صحافت کا وجود ہوا کیونکہ اس نے 1798 عیسوی میں قاہرہ سے دو اخبار فرانسیسی زبان میں نکالنا شروع کیا۔

1855 عیسوی میں رزق اللہ حسون جلی نے استنبول سے "مراۃ الاحوال" کے نام سے عربی زبان میں ایک جریدہ کا اجراء کیا، جس کو عربی زبان کا سب سے پہلا نجی اخبار ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بعد عرب ممالک میں عربی اخبارات نکلنے شروع ہوئے۔ صحافت کو ابتدائے اسلام بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کی نشرو اشاعت میں تحریر کا استعمال کیا ہے۔ چنانچہ آپ نے متعدد خطوط صحابہ کرام کے ذریعے جزیرہ یا جزیرہ کے باہر امراء ملوک کے یہاں ارسال کئے تھے اور ان تحریری خطوط کے ذریعہ ان کو اسلام سے باخبر اور روشناس کرانے کی کوشش کی تھی اور یہ عمل بڑی حد تک موجودہ صحافت سے مشابہت رکھتا ہے۔

ہندوستان کے پس منظر میں دیکھیں تو معلوم ہوگا ۔ کہ صحافت کو ادب کی ایک صنف کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے یہاں کی جامعات میں شعبہ اردو کے نصاب میں صحافت کو ادبی اصناف کے ذیل پڑھایا جاتا ہے۔ لیکن اس سے فن کا حق ادا نہیں ہوتا۔ لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ صحافتی تحریروں کو ادبی تحریر تسلیم کرنے میں اب بھی شش و پنج کی حالت برقرار ہے۔ جن تحریروں کو ادبی اصناف میں شامل نہیں کیا گیا ہے، وہ تحریریں ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور اخبار میں چھپی روزانہ کی خبروں کا حصہ بن کر بھلا دی جاتی ہیں، جو یقینی طور پر ادب کا بہت بڑا خسارہ ہے۔ ادب اور صحافت میں رشتے کے بارے میں رشید حسن خان لکھتے ہیں۔

''ادب اور صحافت میں دوری کی نسبت ہے، مگر یہ دونوں نسبتیں ایک ہی شخص میں بہ خوبی جمع ہوسکتی اور اس کی تحریروں میں نمایاں ہوسکتی ہیں۔

(3, اردو صحافت، صفحہ 265، اردو اکیڈمی، دہلی)

ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز کیسے ہوا اور کن مراحل سے گزر کر ہوا اور کن مراحل سے گزر کر ہوا اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد شاہد حسین "ابلاغیات" میں لکھتے ہیں۔

''دنیا کے دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی چھاپے خانے سے پہلے خبر رسائی کے مختلف طریقے مروج تھے۔ ڈھنڈھورچیوں کے ذریعے تازہ شاہی فرمان، نیلامی کی اطلاعات اور دوسری بہت سی خبریں شاہراہوں اور بازاروں میں با آواز بلند سنائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ آوارہ گرد فقیر، سادھو، سیاح، خانہ بدوش، تاجر، بنجارے، شاعر، مسخرے اور مطربوں کو بھی خبر رسائی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پتھروں پر فرامین، مزہبی احکامات اور اخلاقی اصول کندہ کر کے جگہ جگہ نصب کرائے جاتے۔ اشوک کے کتبے اس کی مثال ہیں۔ اس کے بھی شواہد ملتے ہیں کہ بدھ مذہب کے اصول پتھروں پر کندہ کر کے سری لنکا اور دوردراز مقامات بھیجے گئے تھے۔''

4 صفحہ نمبر 46

ہندوستان میں مطبوعہ اخبار پہلے پہل نکالنے کا سہرا ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ہی ایسے برطرف ملازم مسٹر ولیم بولٹس کے سر جاتا ہے۔ اس سلسلے میں محمد عتیق صدیقی لکھتے ہیں۔

''ہندوستان میں مطبوعہ اخبار نکالنے کا خیال سب سے پہلے کمپنی کے ایک ایسے ہی برطرف ملازم مسٹر ولیم بولٹس کو آیا۔ برطرف ہو جانے کے بعد مسٹر بولٹس ہندوستان اور برطانیہ کے مختلف حلقوں میں کمپنی کی بداعمالیوں کے خلاف احتجاج کرتے رہتے تھے۔ 1768 عیسوی میں بولٹس کی طرف سے کلکتہ کونسل ہاؤس کے دروازے پر ایک اشتہار چسپاں کیا گیا۔''

5 صفحہ نمبر 47

4۔ صحافت کے مقاصد

اطلاعات فراہم کرنا، ذہن سازی کرنا، انٹرٹینمنٹ، صحافت خواہ کسی بھی زبان میں ہو اور میڈیا کسی بھی نوعیت کا ہو، اس کے مقاصد مزکورہ تینوں امور کے گرد گھومتے ہیں۔

5۔ صحافت کی قسمیں:

1۔ پرنٹ میڈیا 2۔ الیکٹرانک میڈیا

پرنٹ میڈیا

پرنٹ میڈیا میں تمام نوعیت کے کتب، اخبارات، رسائل، جرنلزم، کیٹلاگس، براؤشرز، لیفلیٹز، ہینڈ آؤٹس اور دیگر مطبوعہ دستاویز کا شمار ہوتا ہے۔ ایسے خطوط جو بڑے پیمانے پر لوگوں کے درمیان سرکلیٹ کئے جاتے ہیں، ان کا شمار بھی پرنٹ میڈیا میں کیا جا سکتا ہے۔ یہ عوامی ذرائع ابلاغ میں سب سے قدیم ذریعہ ابلاغ ہے۔

الیکٹرانک میڈیا

الیکٹرانک میڈیا میں ٹیلی ویژن، ریڈیو اور فلم وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ ٹیکنالوجی کے ابتدائی دور میں بھی چاہیے اخبارات ہوں یا ٹیلی ویژن یا ریڈیو، ان

CamScanner

کے مواد پر نظر رکھنے کے لیے ایڈیٹر کا ادارہ بہت موثر تھا، خبر، کالم، فیچر، وقائع نگاری، براڈ کاسٹ ان سب پر ایڈیٹر کی مضبوط گرفت رہی ہے لیکن سوشل میڈیا کی آمد نے اس ادارے کو تقریباً ختم کر دیا اور بغیر کسی تربیت کے بغیر زبان و بیان کی تصحیح کے صحافت "ٹاور آف بیبل" بن کر رہ گئی جہاں آوازیں تو تھیں لیکن سب الجھی ہوئی جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

اردو زبان وصحافت کی مختصر جھلکیاں

ہندوستان میں اردو صحافت کا باضابطہ آغاز کلکتہ کی سرزمین سے 27 مارچ 1822ء کو "جام جہاں نما" سے ہوا۔ اس اخبار کے بانی ہری ہردت اور ایڈیٹر منشی سدا سکھ تھے۔ اس سلسلے میں گربچن چندن اپنی اپنی کتاب ''اردو صحافت کا سفر'' میں رقمطراز ہیں:

'' اردو کا اولین اخبار "جام جہاں نما" "مرأتہ الاخبار" سے تقریباً ایک ماہ قبل شروع ہوا اس کا بانی ہری ہردت ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک کلرک تھا اس نے سرکاری ملازم ہونے کے باوجود برطانوی راج کی لغزشوں، شوخیوں اور کوتاہیوں پر نکتہ چینی کی۔ ان دنوں عدالتوں اور اشراف راج کی زبان فارسی تھی، ان حالات کے تحت ''جام جہاں نما'' ابتدائی قریب دو ماہ کے بعد فارسی چھپنے لگا۔ لیکن اس کے بانی ہری ہردت نے عوامی زبان اردو میں اخباری جاری رکھنے کا خیال نہ چھوڑا اور ایک سال بعد فارسی ایڈیشن کے ساتھ چار صفحات کا ایک آزادانہ اردو ضمیمہ بھی شامل کیا جو قریب پانچ سال تک چھپتا رہا۔ حکومت اس کی آزادی سے خاموش تھی۔ لہٰذا اس کی رعایتی ڈاک کی آمد بند کر دی اخبار نے امداد کی بحالی کوئی درخواست نہ دی بلکہ اپنی پیشانی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی مہر مٹا دی جو روز اوّل سے شائع ہو رہی ہے۔''6 صفحہ نمبر 49

اردو صحافت کی چوٹی سے نمودار ہونے والا دوسرا اخبار "دہلی اخبار" ہے۔ اخبار کو مولانا محمد آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے 1837 عیسوی میں دہلی سے نکالنا شروع کیا۔ 13 مئی 1840 عیسوی کو اس اخبار کا نام "دہلی اخبار" کی بجائے "دہلی اردو اخبار" کر دیا اور پھر 12 جنوری 1857 عیسوی کو اس کا نام بدل کر "اخبار الظفر" رکھ دیا گیا۔ اس اخبار میں ادبی تحریروں کے علاوہ مرزا اسداللہ خان غالب، مومن خان مومن، اور بہادر شاہ ظفر کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ اردو صحافت میں تیسرے اخبار کی حیثیت سے 1837ء میں ''سید الاخبار'' منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوا۔ اس اخبار کے بانی مصلح قوم سر سید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمد خان تھے۔ انہوں نے اس اخبار کو دہلی سے جاری کیا۔ چونکہ سید محمد خان سرکاری ملازم تھے اس لیے انہوں نے اس اخبار کا ایڈیٹر مولوی عبدالغفور کو بنا دیا۔ سید محمد خان کے انتقال کے بعد خود سر سید نے کچھ دنوں اس کی نگرانی کی اور اس کے لیے مضامین لکھے بلکہ یہ کہا جائے کہ سر سید نے بعد میں تہذیب الاخلاق میں جو مقبول عام طرز تحریر اختیار کیا اس کی ابتدائی مشق اسی اخبار کے صفحات پر ہوتی ہے۔

سر سید احمد خان نے 1866 میں عیسوی میں ''اخبار سائنٹفک سوسائٹی'' جاری کیا۔ یہ اخبار ہفت روزے تھا۔ اس کے ایڈیٹر خود سر سید احمد خان تھے۔ اردو صحافت کے ارتقاء میں اس اخبار کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس نے صحافت میں آزادی رائے سنجیدگی اور صحت وواقعات پر زور دیا۔ اس کے علاوہ 1879 عیسوی میں سر سید احمد خان نے ایک رسالہ "تہذیب و اخلاق" کے نام سے جاری کیا۔ یہ رسالہ اگرچہ بنیادی طور پر اصلاحی مقاصد کے تحت جاری کیا گیا تھا لیکن اس نے ہم عصر اردو صحافت کو اسلوب اور طرز ادا کے معاملے میں روشنی دکھائی۔

6۔ اردو صحافت میں ادبی تبصروں کی روایت

میتھو آرنلڈ نے صحافت کو ادب کی عاجلانہ تخلیق یا عجلت میں تحریر شدہ ادب قرار دیا ہے۔ اس کے الفاظ میں Journalism is a Literature in a hurry ''یعنی صحافت وہ ادب ہے جو عجلت میں تخلیق کیا گیا ہو۔'' اردو لغات میں صحافت کے معنی اخبار نویسی، اخباری کاروبار اور رسالہ نویسی ہیں تھوڑی سی وضاحتی توسیع کی جائے تو تازہ خبریں جمع کرنے اور انھیں ایک معینہ وقفے سے شائع کرنے کا نام صحافت ہے۔ انسائکلوپیڈیا آف برٹانیکا (مطبوعہ لندن 1986ء) میں صفحہ نمبر 86 پر اس کی مزید توضیح کی گئی ہے۔ اور صحافت کے کئی شعبوں کو اس کے احاطہ تعریف میں شامل کر لیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق: ''صحافت سے مراد خبر اور خبر سے متعلق مواد کا حصول، جمع کاری، ترتیب وتدوین، فیچر نگاری، تنقید و تبصرے کے بعد اخبار، رسالہ پمفلٹ، ریڈیو، ٹیلی ویژن، قلم یا کتاب کے وسیلے سے اشاعت اور اس کی تقسیم ہے۔''7 صفحہ نمبر 295

گویا صحافت کے سروکار، اور دائرہ اختیار میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ صحافت کی موجودہ تعریف میں تنقید وتبصرہ جزو لازم کی حیثیت رکھتے ہیں حالانکہ یہ حیثیت انھیں پہلے بھی حاصل تھی۔ صحافت کو بے لگام ہونے سے بچانے اور اس کی صحت وصفائی اور معیار اعتبار کو پڑھنے اور پرکھتے رہنے کے لیے معروضی تنقید کا عمل اخبار نویس کے تحت الشعور اور بین السطور میں ہمیشہ جاری وساری رہتا تھا، مگر اب داخل کے ساتھ خارج کو بھی اس کی اہمیت اور افادیت کا احساس ہو گیا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا کی تعریف اسی احساس کا اظہار ہے۔

اردو ادب میں تنقید وتبصرے کی روایت کافی قدیم ہے ہمارے تذکرہ نگاروں نے اپنے عہد کے

شعراء پر کھل کر رائے زنی کی ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کے جملے تو اس قدر مشہور ہوئے کہ ضرب المثل بن گئے۔ یہ جملے ایک قسم کے تبصرے ہی تھے جو لوگوں کو بھا گئے اور ایسے بھائے کہ ان کی تقلید میں بعد میں آنے والوں نے بھی خوب جملے بازیاں کیں اور ان کے جملے بھی خوب پھلے پھولے جیسے دیوان غالب پر عبد الرحمن بجنوری کا یہ تبصرہ، ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں وید مقدس اور دیوان غالب۔ حالی کی کتاب جاوید پر شبلی کا ریمارک ''مدلل مداحی'' کلیم و الدین احمد کا جملہ"اردو تنقید معشوق کی موہوم کمر ہے۔

''رشید احمد صدیقی کا قول'' غزل اردو شاعری کی آبرو ہے، نیاز فتح پوری کا اصغر گونڈوی کی صوفیانہ شاعری کو جھاڑ پھونک والی شاعری کہنا اور جوش ملیح آبادی کی شاعری پر یہ جملہ کسنا کہ ان کے ہاں گالی دینے کا جزبہ شاعری میں ڈھل جاتا ہے، اسی ذیل میں آتے ہیں۔ غور سے دیکھیں تو ان جملوں میں ذہانت، ذکاوت اور توانائی ضرور ہے اور تھوڑی بہت صداقت بھی مگر یہ بہر حال جملے بازیاں ہیں، ان سے ادب کا بھلا ہو سکتا ہے نہ ادیبوں کا نقصان کا اندیشہ ضرور باقی رہتا ہے۔ وہ اس طرح کہ کبھی کبھی بڑی شخصیتوں کے قلم سے نکلے ہوئے اس قبیل کے چمکدار جملے ادب، کے عام قاری کو اس حد تک متاثر کر دیتے ہیں کہ وہ، گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آج اردو کی کتابیں ہیں کہ چھپتی جا رہی ہیں اور اردو ہے کہ چھپتی جا رہی ہے۔ غیر علمی وغیرہ اور ادبی مصروفیات نے پڑھنے پڑھانے کا وقت چھین کر الیکٹرانک میڈیا یا خصوصاً ٹیلی ویژن کے حوالے کر دیا ہے۔ شوق مطالعہ جو کبھی تعلیم یافتہ بزرگوں کا سہارا ہوا کرتا تھا۔ اب اس پر ٹی وی نے قبضہ کر لیا ہے۔ ان حالات میں تبصروں کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔

فی زمانہ کم وبیش تمام اردو ماہنامے اور سہ ماہی ادبی رسائل، کتب و جرائد پر پابندی سے تبصرے شائع کرتے ہیں۔ چند ہفت روزہ اخبارات مثلاً ہماری زبان (دہلی)، عالمی سہارا (دہلی)، صدائے اردو (بھوپال)، خبردار (دہلی) وغیرہ بھی یہ بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ اگر صرف ہندوستان کے ادبی رسائل کی فہرست تیار کی جائے تو پچیس تیس رسالوں نام فوراً ذہن میں آ جاتے ہیں۔ جن میں شب خون (آلہ آباد)، شاعر (ممبئی)، آج کل دہلی، تمثیل نور (دربھنگہ)، انشاء (کلکتہ) جدید فکر و فن (شملہ) اور اردو بک ریویو (دہلی) جیسے سہ ماہی ادبی رسائل شامل ہے۔

انصاری نے اپنی تصنیف کتاب شناسی میں ماضی قریب کے چند رسائل کے حوالوں سے تبصرہ کے چار رجحانات کی نشان دہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''بے محل نہ ہو گا، اگر ہم یہاں اردو کے کتابی تبصروں میں رونما ہونے والے چار اہم رجحانات کا کھلے لفظوں میں اعلان کرتے چلیں۔ یہ رجحان دوسری جنگ عظیم کے بعد خصوصیت سے سامنے آئے ہیں۔''

8 صفحہ نمبر 302

ایک تحقیقی رجحان

یعنی علم و ادب کے بعض مسلمات کو، مفروضوں کو، شہرت یافتہ بیانات کو، تحقیقی نظر سے چھیلنا، کریدنا اور ان کی کوتاہیاں ثابت کر کے حقیقت تک پہنچنا، پہچانا، حافظ محمود شیرانی سے قاضی عبدالودود اور ان سے گیان چند جین، ممتاز حسین، رشید حسن خان، نثار احمد فاروقی، شیام لال کالرا، (عابد پشاوری) تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

دوسرا تنقیدی رجحان

جو کسی اہم اور بحث طلب تصنیف کے ہر پہلو سے بحث کر کے اس کے علمی اور جمالیاتی پہلو کبھی لپیٹ کر، کبھی بے رو رعایت بیان کریں اور اصل تصنیف کی خامیاں اور خوبیاں جتانے میں خود اس کی ترمیم اور تکمیل کر دے، یوسف حسین خاں کی روح اقبال پر احتشام حسین اور آل احمد سرور کے مفصل تبصرے خلیل الرحمن اعظمی کے ادبی تبصرے، عابد رضا بیدار کی اختلافی تصنیف، سیما کی تلاش، اور ڈاکٹر محمد حسن کا تبصرہ اس ضمن میں آتے ہیں۔

تیسرا تعبیری رجحان

یہ کہ کسی نظریاتی پہلو کو ابھارنے، فروغ دینے، اس کی تصدیق و تائید کرنے کے لیے زیر تبصرہ کتاب کو استعمال کیا جائے مصنف کے تصورات، (آئیڈیالوجی) کی روشنی میں تصنیف کی فنی حیثیت کو اٹھایا، ابھارا ورنہ دبا دیا جائے۔ جمالیاتی سطح پر بھی تصنیف کی مٹی میں اتنا گہرا بل چلے کہ زیر زمین رطوبت اچھل پڑے۔ حسن عسکری، میرا جی، وزیر آغا، شمس الرحمان فاروقی، کرامت علی کرامت وغیرہ اس رجحان کے علمبردار ہیں۔

چوتھا رجحان تکلف

ہر طرف کا اندازہ یہ کہ صاحب ذوق پڑھنے والے کی طرح تصنیف کا مطالعہ کیا اور مختصر لفظوں میں مطالعہ کرایا جائے۔ ضمنی کہانی سنی بھی جائے نہ کسی مقررہ نظریے کی بندش نہ کسی مصلحت کی آمیزش کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں جو تاثر سر محفل بیان ہو سکتا ہے۔ وہ بے تکلف بیان کیا جائے مگر اس طرح کہ تبصرہ نگار کے ساتھ تبصرہ پڑھنے والا بھی لطف اندوز ہو اور اصل تصنیف کے لب و لہجہ سے نا آشنا نہ رہے۔

7۔ زبان کا فرق

ادب اور صحافت دونوں کی زبان میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ صحافت کی زبان آسان عام فہم اور کثیر الاستعمال ہوتی ہے، جب کہ ادب کی زبان عام طور پر ثقیل اور طرح طرح کی لسانی پیچیدگیوں کو اپنے ساتھ لئے ہوتی ہے۔ صحافت کی زبان کو پہلی نظر میں پڑھ کر سمجھا جا سکتا ہے، لیکن ادب کی زبان کو بعض اوقات

لغت سے حل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ نوطرز مرصع سے لے کر آج تک کے ادب کو مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ صحافتی تحریروں میں تشبیہات واستعارات، ایجاز واطناب، اشارے اور کنائے، محاورہ اور ضرب المثل وغیرہ کا استعمال نہیں ہوتا، کوئی بھی بات براہ راست کہی جا سکتی ہے جب کہ ادبی تحریریں ان خصوصیات کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتیں۔ صحافت میں ترسیل کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ قارئین کو پیش نظر رکھ کر عبارت لکھی جاتی ہے۔ معاشرے کے جس طبقے کو مخاطب کرنا ہوتا ہے، اسی لحاظ سے الفاظ اور جملوں کی ترکیب اختیار کی جاتی ہے۔ جب کہ ادب میں دقیق الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے، عوام کے بجائے خواص کو مدنظر رکھ کر عبارت لکھی جاتی ہے اور اس کا کینوس بڑا ہوتا ہے۔

8۔ بیان کا فرق

صحافت بیانیہ صنف ہے۔ نثر میں ہی صحافت کا رواج عام ہے۔ جب کہ ادبی تخلیقات نثر اور نظم دونوں میں ہوتی ہیں۔ صحافت ایسی بیانیہ نثر ہے جو سریع الفہم ہونے کے علاوہ اس کی ادائیگی بھی نسبتاً آسان ہوتی ہے۔ ادب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بعض اوقات آسان پیرا میں لکھی گئی ادبی تحریر کو صحافیانہ تحریر کا نام دے دیا جاتا ہے۔ دونوں میں یہ فرق بیان کی خصوصیات کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ ادب میں جب تک لچھے دار عبارت نہ ہو، گھوما پھرا کر بات نہ کہی جائے اس وقت تک

مزا ہی نہیں آتا۔ مافوق الفطری عناصر، کردار، مکالمہ، فضا، منظر کشی، کش مکش، مرکزی خیال، زمان و مکان وغیرہ ادبی تحریروں کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ صحافت میں پانچ ک سے کام چلایا جاتا ہے۔ تبصرے فیچرز، مضامین اور ادارے وغیرہ ان واقعات کو نگاہ میں رکھ کر تحریر کئے جاتے ہیں۔

9۔ ادبی صحافت

اردو زبان میں ادبی صحافت کی ایک دنیا آباد ہے۔ وہ رسالے اور میگزین جن میں ادبی اصناف پر مشتمل مضامین، شعری اور نثری اصناف، ادبی سر گرمیوں اور ادبی تحریکات سے متعلق مواد شائع کئے جاتے ہیں۔ اسے ادبی صحافت کا نام دیا جاتا ہے۔ ادبی اصناف پر مشتمل جو تحریریں میڈیا میں شائع ہوتی ہیں۔ انہیں ادبی صحافت کہتے ہیں۔ اس حیثیت سے اردو صحافت اور ادب کے درمیان رشتے کی گنجائش نکلتی ہے۔ خواہ صحافتی تحریروں کو ادب تسلیم کریں یا نہ کریں۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ادب اور صحافت کے مابین مضبوط رشتے ہیں۔ ان رشتوں کے الگ الگ گوشوں پر کھل کر بحث کی گنجائش ہے۔

10۔ نیو میڈیا

لیکن سوشل میڈیا کی آمد نے اس ادارے کو ختم کر دیا اور بغیر کسی تربیت کے، بغیر بیان کی تصحیح کے صحافت، ''ٹاور آف بیبل'' بن کر رہ گئی جہاں آوازیں تو تھیں لیکن سب الجھی ہوئی جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جو چند ادارے صحافتی اقدار کی پاسداری کر رہے ہیں ان کی زبوں حالی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ صرف پاکستان ہی میں نہیں ہوا بلکہ دنیا بھر میں ایسا ہو رہا ہے کہ سوشل میڈیا کے اگر مثبت اثرات ہوئے ہیں تو اس کے منفی اثرات صحافت پر ہوئے لیکن جن معاشروں میں تعلیم، اقدار، اخلاقیات اور قوانین کی پابندیاں کی جا رہی ہیں وہ معاشرے سوشل میڈیا کو تفریح کے طور پر تو لے رہے ہیں لیکن اسے سنجیدہ صحافت سے الگ سمجھا جاتا ہے۔

کچھ ذکر کرتے ہیں آج کی صحافت کا، جیسا کہ پہلے میں نے اشارہ دیا کہ سوشل میڈیا کی آمد کے ساتھ صحافت کچھ بکھر کر رہ گئی ہے اور اس اطلاعات کے طوفان میں سنجیدہ صحافت اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب صحافیوں کو بہترین عملی تربیت فراہم کی جائے اور اس تربیت سے مکمل فائدہ اسی وقت اٹھایا جا سکتا ہے جب صحافی کتاب پڑھنا اپنی عادت بنالیں کہ الفاظ کے ذہن اور تحریر کے لیے ایندھن کا کام کرتے ہیں۔ ایسی کتب صحافتی تحریروں کو ایک ترتیب دے سکتی ہیں، جہاں سے صحافی ایسے مناسب اور معیاری الفاظ کا چناؤ کر سکتے ہیں جو کسی بھی تحریر کو معیاری بنا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں مقتدر نے ایک بے مثال کتاب ''جدید صحافی انگریزی اردو لغت'' کے نام سے شائع کی ہے اور کئی صحافی اس کتاب سے استفادہ بھی کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں اس چیز کی بھی اشد ضرورت ہے کہ خود پرانے اور نئے دونوں صحافی ایسی کتابیں لکھیں جو ان کے صحافتی تجربات کا نچوڑ ہوں اور آنے والوں کے لیے راہنمائی کر سکیں۔

اس وقت جس میڈیا کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، وہ نیو میڈیا ہے۔ انٹرنیٹ اور موبائل کو نیو میڈیا کہتے ہیں۔ نیو میڈیا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عوامی ترسیل کا ذریعہ ہوتے ہوئے بھی یہ اپنے ناظرین کے درمیان باہمی روابط کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ای۔میل، بلاگ، فیس بک، یوٹیوب، ٹویٹر، واٹس ایپ، انسٹاگرام، اور سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس وغیرہ کا شمار نیو میڈیا میں ہوتا ہے۔ نیو میڈیا نے دیگر ذرائع ابلاغ کو دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پرواز کی صلاحیت عطا کر دی ہے۔ مثلاً انٹرنیٹ کی وجہ سے دوسرے ترسیلی ذرائع کی بہت سی مشکلات پلک جھپکتے ہی دور ہو جاتی ہے۔ ادب کے فروغ میں بھی نیو میڈیا کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ انٹرنیٹ پر تمام موضوعات کی کتابیں شعرا اور ادیبوں کے حالات زندگی اور رسالے وغیرہ موجود ہیں۔ پوری کی پوری لائبریری انٹرنیٹ پر دستیاب کرنے کا رواج زور پکڑ رہا ہے۔

افضل گوہر راؤ/سرگودھا

فلک کو دور سمجھتے ہیں یہ پرند مگر
جو میں اُڑوں تو وہاں تک اُڑان کچھ بھی نہیں

وہاں پہ کس لئے تُو بھی قطار باندھتا ہے
جہاں پہ خود ہی شکاری شکار باندھتا ہے
میں اُس کی قید سے آزاد ہونا چاہتا ہوں
اسی لئے وہ مجھے بار بار باندھتا ہے
جو تیرے دل میں ہے چہرے سے پڑھ رہا ہوں میں
کسی دلیل سے کیوں اعتبار باندھتا ہے
تمام سبز پرندے تو اُڑ چکے گوہر
تُو کیوں درخت سے پھولوں کے ہار باندھتا ہے

رات ہی تاریک تھی سو خواب کالا رہ گیا
آنکھ میں اُڑتے ہوئے منظر کا جالا رہ گیا
تُو نے دیکھا ہی نہیں اُس ڈوبتے سورج کا قہر
میں نے دیکھا تھا مری آنکھوں میں چھالا رہ گیا
اتنا کاندھوں پر مشقت کی تھکن کا بوجھ تھا
ہاتھ میں اکثر مرے منہ کا نوالہ رہ گیا
لوگ رُخصت ہو گئے لیکن حفاظت کے لئے
گھر کے دروازے پہ اک لوہے کا تالہ رہ گیا

جو آتا ہے وہ جانے کے لئے تیار لگتا ہے
یہ آدم زاد مٹی سے بہت بیزار لگتا ہے
کسی نے خود بنائے ہیں یہ منظر شہرِ خوباں کے
جسے دیکھو وہ خدوخال سے شہکار لگتا ہے
ہمیشہ آ کے ملتے ہو وفا کی گرمجوشی سے
تمہارا ہاتھ لیکن مجھ کو ٹھنڈا ٹھار لگتا ہے
زباں کا ذائقہ بدلہ ہے یا حالات بدلے ہیں
کہ اب اپنا کہا اپنے لئے آزار لگتا ہے
کسی نے بن دیئے پیچ و خمِ دستار کچھ ایسے
کہ جو غدار ہے وہ شہر کا سردار لگتا ہے

آئی تھی اس طرف جو ہَوا کون لے گیا
خالی پڑا ہے طاق دِیا کون لے گیا
دشمن عقب میں آ بھی گیا اور ابھی تلک
تم کو پتہ نہیں ہے عصا کون لے گیا
اس شہر میں تو کوئی سلیمان بھی نہیں
میں کیا بتاؤں تختِ سبا کون لے گیا
اپنے بدن سے لپٹا ہوا آدمی تھا میں
مجھ سے چھُڑا کے مجھ کو بتا کون لے گیا
گوہر یہ ماجرا تو پرندوں سے پوچھنا
پیڑوں کو کیا پتہ ہے ہَوا کون لے آگیا

ستم تو یہ ہے کہ ہاتھوں میں جان کچھ بھی نہیں
وگرنہ سامنے رکھی چٹان کچھ بھی نہیں
فلک کو دُور سمجھتے ہیں یہ پرند مگر
جو میں اُڑوں تو وہاں تک اُڑان کچھ بھی نہیں
وہاں پہ دھوپ بھی آتی ہے اور بارش بھی
سمجھ رہے ہو جہاں سائبان کچھ بھی نہیں
میں پوجتا ہوں ترے آسمان کو لیکن
تری نظر میں مرا خاکدان کچھ بھی نہیں
گزر رہا ہوں جہاں سے کچھ اس طرح جیسے
ہَوا کے بعد ہَوا کا نشان کچھ بھی نہیں

بنا دیا ہے ترے سائے کی مثال مجھے
جہاں بھی دھوپ لگے جسم سے نکال مجھے
میں آئنہ نہ بناتا تو اور کیا کرتا
کہ خود بھی دیکھنے تھے اپنے خدوخال مجھے
میں آفتاب تو تھا لیکن اے چراغ کی لَو
تجھے بچاتے ہوئے آ گیا زوال مجھے
چمن میں سازشِ آب و ہَوا کچھ ایسی تھی
کہ پیڑ لگنے لگے پنچھیوں کے جال مجھے
پڑا ہوا ہوں کسی رہگزار کی صُورت
گزرتے جاتے ہیں سب کر کے پائمال مجھے

کیوں نہ کہیں اک اور نئی بنوا لی جائے
ایک ہی قبر پہ کتنی مٹی ڈالی جائے
ابھی تو پیڑ کٹیں گے پت جھڑ آئے گی
ریزہ ریزہ چُن کر چھاؤں سنبھالی جائے
ہر مٹی کا اپنا وزن ہُوا کرتا ہے
ٹھوکر سے بھی کتنی خاک اُچھالی جائے
ابھی تو اِس منظر کے بعد بھی منظر ہے
دیکھنا ہے تو آنکھ سے دُھند ہٹا لی جائے
دن کو چھان پھٹک کر دیکھ چکا ہوں میں
کون سے رُخ سے کالی رات اُجالی جائے

اجمل ساقی / لالہ موسیٰ

ہمیں تو چڑھتا ہے دونوں کا ایک سا نشہ　　اگر شراب نہیں ہے کتاب ہو ساقی

اجمل ساقی لالہ موسیٰ سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر، خطاط اور مصور ہیں۔ وہ دی ہوورڈ گرلز کالج بھٹہ میں شعبۂ اردو کے پروفیسر اور پرنسپل کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ غزل ان کا خاص میدان ہے جہاں وہ سادہ مگر پُراثر انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت ادب اور فنون لطیفہ کا خوبصورت امتزاج ہے۔ (ارژنگ)

ہے غم زدوں کا فقط غم گسار مئے خانہ
فریبی دنیا میں یاروں کا یار مئے خانہ
یہ آنکھیں جام وسبو ہیں یہ اشک بہاتی شراب
ہمارے چہرے کا ہے اعتبار مئے خانہ
تمام رات جگاتے ہیں مئے کدے کو ہم
سو دن میں ہم کو رکھے بے قرار مئے خانہ
تمہارے چہرے کی ہیں ویل انجم و مہتاب
تمہاری آنکھ پہ قرباں ہزار مئے خانہ
جو تم نے ہوش گنوایا تو اس کی شان بڑھی
جو لڑ کھڑائے ہوا با وقار مئے خانہ
خفا ہوں تم سے تو اپنی طرف نہیں آتے
ہمیں تو کھینچتا ہے بار بار مئے خانہ
سنا ہے آج سر شام چل دیئے ساقی
سو رش کے بعد بھی ہے سوگوار مئے خانہ
فقیرِ مستی میں تجھ سے کلام کرتے رہیں
سدا یونہی رہے پروردگار مئے خانہ
جھنگ کے سر کو بھلا سکتے ہیں اسے لیکن
ہمارے سر پہ ہے ساقی سوار مئے خانہ

پیار ہے، کیا کروں، مشورہ، ساقیا
میں جیوں یا مروں کچھ بتا ساقیا
کیا حسیں شام ہے شام بدنام ہے
تجھ سے اک کام ہے مئے پلا ساقیا
رات بھی سرد ہے چاند بھی زرد ہے
دل میں کچھ درد ہے کچھ تو گا ساقیا
جس کے ہم ہو چکے دو جہاں کھو چکے
رو چکے،وہ تو تھا،اور کا ساقیا
کیا کروں میں یہاں لڑکھڑائے زباں
عشق کی داستاں تو سنا ساقیا
آنکھ میں خواب ہے خواب نایاب ہے
تجھ میں گر تاب ہے پاس آ ساقیا
سب گئے چھوڑ کر رستہ ہے اب نہ گھر
میرے اس حال پر مسکرا ساقیا
ڈولتا ہے نگر جانے ہوں میں کدھر
مجھ کو تو تھام کر ڈگمگا ساقیا
سب گئے چھوڑ کر دل مرا توڑ کر
تو بھی منہ موڑ کر دل دکھا ساقیا

وہی ہے مستی اسی جوش سے بھری ہے شراب
تری جوانی سے جیسے بنی ہوئی ہے شراب
وگرنہ موت کا سامان ہیں یہ جام و سبو
تمہارے ہاتھ سے پی لیں تو زندگی ہے شراب
لگا کہ بیٹھا ہوں سگریٹ ترے خیالوں کا
ادھر گٹار پڑا ہے ادھر پڑی ہے شراب
تمہارے چاہنے والے اکٹھے تھے کل رات
تمہاری بات چلی اور کیا چلی ہے شراب
ہر ایک جھونکا ہوا کا ہے اتنا مست خرام
فضا میں جیسے کسی نے انڈیل دی ہے شراب
وہی ہے مستی اسی جوش سے بھری ہے شراب
تری جوانی سے جیسے بنی ہوئی ہے شراب
کبھی کبھی تو وہ آنکھیں خموش ہوتی ہیں
کبھی کبھی تو ان آنکھوں میں بولتی ہے شراب

پلا، تو جتنی بھی حالت خراب ہو ساقی
کہ دکھ ہے ایسا مسلسل شراب ہو ساقی
طلب ہماری زیادہ ہے تم پہ دوش نہیں
ہمارے سامنے کیوں آب آب ہو ساقی
بس ایک جام کچھ ایسا شب فراق کی رات
کہ جس کے شیشے میں اس کا شباب ہو ساقی
ہمیں تو چڑھتا ہے دونوں کا ایک سا نشہ
اگر شراب نہیں ہے کتاب ہو ساقی
تمہارے پاس نہ آئے تو وہ کہاں جائے
وہ جس کا جینا یہاں پر عذاب ہو ساقی
ہمارے رنگ پہ اس کا بھی رنگ چڑھ جائے
برانڈ ایسا ہو چہرہ گلاب ہو ساقی
تمہاری آنکھوں میں جتنے سوال ہیں ان کا
جواب یہ ہے کہ تم لاجواب ہو ساقی
یہ کائنات ہمارے لیے ہے مئے خانہ
سفر کہیں کا نہیں ہمرکاب ہو ساقی

CamScanner

تیشے کو سر پہ مار کے فرہاد مر گیا
دنیا پہ تیری بندۂ آزاد مر گیا
بیٹھے ہیں ایک فکر میں آہو یہ دشت کے
اپنا بھی ہوگا کیا کہ جو صیاد مر گیا
ایسا فریب مجھ کو دیا ہے حسین نے
میرے بھی دل سے خدشہ اُفتاد مر گیا
جس کو کبھی نہ درد کی نعمت ہوئی نصیب
وہ آدمی جہان میں بے داد مر گیا
مرنے پہ میرے شاہ سخن ور کہیں گے یہ
دنیا سے تیری صاحب ایجاد مر گیا

انصاف کی کتاب میں انصاف اب کہاں
انصاف کی کتاب میں انصاف ہے گماں
جانے یہ کون کون چھپا آدمی میں اب
رہزن تھا وہ کہ جس کو کہا میر کارواں
ہر آن انتظار رہا موت کا مجھے
آنے سے موت کے نہ مٹیں دل کی تلخیاں
مُردے کا کاروبار بھی کرتے ہیں روزِ مرگ
جن کو جہاں میں لوگ سمجھتے ہیں ہستیاں
وہ دور جس میں لوگ مسرت پسند تھے
وہ دور اب نہیں کہ ہیں سنسان بستیاں
وہ لوگ جن کی ذات تھی اسلام کا ظہور
وہ لوگ جن کی ہار تھی ساحل کی کشتیاں
وہ لوگ جن کی زُہد وعمل میں تھیں رونقیں
وہ لوگ اب کہ چھوڑ چلے اپنا یہ جہاں
وہ شاہ کر رہے ہیں تمہاری تلاش اب
اُن کو خبر کہاں کہ ہوئے آپ لامکاں

بیٹھا تھا تیرے ساتھ مری آنکھ کھل گئی
ممکن تھی ملاقات مری آنکھ کھل گئی
سمجھا تھا اے جہان! تجھے دائمی جمال
دنیائے بے ثبات! مری آنکھ کھل گئی
سوچا نہ تھا یہ میں نے کبھی ہوش آئے گا
دنیا ہے ممکنات مری آنکھ کھل گئی
کھلنے نہ پائے آنکھ تو برسوں نہ کھل سکے
کچھ تو ہوئی ہے بات مری آنکھ کھل گئی
دنیا کی ظلمتوں میں کہاں روشنی ملے!
گزری تھی آدھی رات مری آنکھ کھل گئی
اللہ کا کرم ہے تکبر سے دور ہوں
خاکی ہے میری ذات مری آنکھ کھل گئی
میں سو رہا تھا رات کو غفلت کی نیند میں
کیسی ہے مکافات مری آنکھ کھل گئی
ممکن نہیں فقیر کبھی مردہ اُٹھ سکے
ہے یہ عجیب بات مری آنکھ کھل گئی

کوئی بھی چارہ گر نہیں ملتا
کوئی بھی نامہ بر نہیں ملتا
جس کو ڈھونڈا ہے میں نے دنیا میں
ایسا دنیا میں گھر نہیں ملتا
لاکھ ملتے ہیں لوگ دنیا میں
دوست دنیا میں پر نہیں ملتا
پیر کو صوفی و محقق کو
عشق کا کوئی سر نہیں ملتا
شاہ یہ راز کیوں نہیں کھلتا؟
لاکھ چاہوں بھی پر نہیں ملتا

جس کے دل میں درد نہیں ہے آدم ہے انسان نہیں
جس کے دل میں سوز ذرا ہو حیواں بھی حیوان نہیں
میرے اندر بیٹھا ہمدم باتیں بھی ہوتی ہیں باہم
مجھ کو کر کے اب کے بے دم کہتا ہے پہچان نہیں
جس کو دنیا کہتی ہے دل جس میں خلوت کی ہے محفل
جس کو جانتے ہیں بس عاقل وہ قطرہ خوں بے جان نہیں
صوفی اپنی ذات میں گم ہے ملا اپنی بات میں گم ہے
عاقل کائنات میں گم ہے سب کا ایک ایمان نہیں
فرقہ فرقہ ملت اپنی سمجھو کچھ تو ذلت اپنی
کچھ بھی نہیں ہے علت اپنی یہ پیغامِ قرآن نہیں
شاہ یہ جس نے اپنی خاطر اوروں کا نقصان کیا
اُس کے دل میں درد نہیں ہے ہرگز وہ انسان نہیں

ایسا غم ساتھ ہوا سایہ بھی تنہا نہ رہا
دل میں کچھ روز بھی جینے کا تقاضہ نہ رہا
جس کو جا کر میں سناؤں غمِ دوراں کی خلش
تیرے بھرپور جہاں میں کوئی ایسا نہ رہا
میں تو بے خانہ ہستی میں پھرا برسوں تلک
ہائے افسوس کوئی بھی رُخِ زیبا نہ رہا
جس سے کوئی بھی توقع نہ تھی رُسوائی کی
ہائے گردش! کہ وہ اک شخص بھی اچھا نہ رہا
قیس کی موت کا باعث تھا وہ صحرائے عرب
ایسا بگڑا ہے زمانہ کہ وہ صحرا نہ رہا
مجھ کو فرہاد نے اُستاد کہا ٹال دیا
منصبِ عشق پہ کوئی بھی تو اونچا نہ رہا

پت جھڑ کی چاپ

عامر بن علی/ جاپان

خزاں کے موسم نے دھرتی کے سینے پر دستک دے دی ہے۔ مغربی دنیا میں زرد پتوں کے علاوہ ''ہیلوئین'' کا تہوار بھی اس رت کی پہچان اور امتیازی نشان ہے، جو کہ اب کچھ ہی دنوں کی دوری پر ہے۔ ویسے پت جھڑ کتنا خوبصورت لفظ ہے۔ موسم کا نام ہونے کے ساتھ ساتھ اس رت کے دوران بیتنے والے قدرتی حالات و واقعات کو بھی بیان کر دیتا ہے۔ جاپان کا چونکہ لگ بھگ (80%) اسی فیصد رقبہ پہاڑوں اور جنگلوں پر مشتمل ہے۔ پہاڑ بھی سرسبز، درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اسی لیے خزاں کی دستک سے جاپان کا رنگ بدل جاتا ہے۔ جدھر نظر دوڑائیں، سبزے کی جگہ زردی اور نارنجی رنگ غالب ہوتا نظر آتا ہے۔

یہاں بہار کے جوبن پر جب چیری کے درختوں کی شاخیں پھول اٹھاتی ہیں تو ''چیری بلاسم'' دیکھنے کے لیے لوگ اہل خانہ اور دوستوں کے ہمراہ پھولوں سے لدے ان درختوں کے نیچے چٹائیاں بچھا کر، سامان خورد و نوش کے ہمراہ بیٹھ جاتے ہیں اور ایک تہوار ''ہنامی'' مناتے ہیں۔ اسی طرح خزاں کے موسم میں بھی جب درختوں کے پتوں کا رنگ زرد، نارنجی اور سرخ ہونے لگتا ہے اور وہ پت جھڑ کی ہواؤں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے ہیں، تو بہت سارے جاپانیوں کے نزدیک یہ تہوار کا موقع ہے۔ روایتی طور پر لوگ جوق در جوق گھروں سے نکلتے ہیں، اور فطرت کے قریب کہیں پناہ لیتے ہیں۔ کہیں ٹولیوں کی شکل میں کسی پہاڑی پر پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ کہیں تنہا تنہا جنگل کا رخ کرتے ہیں۔ دریاؤں کے کنارے بھی خزاں کے گرتے پتوں کی آہٹ سننے اور درختوں کے بدلتے رنگ دیکھنے کا مقبول مقام ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جیسے بہار میں چیری بلاسم کے تہوار کے لئے رائج لفظ ''ہنامی'' کا لفظی ترجمہ پھول تکنا ہے۔ خزاں کے رنگ بدلتے، گرتے پتوں کا نظارہ کرنے کے لئے جانے کو ''زرد پتوں کا شکار کھیلنے'' کے لئے جانا کہتے ہیں۔ یوں کہہ لیجئے کہ سوکھے پات دیکھنے جب لوگ پت جھڑ کے موسم میں گھر سے نکلتے ہیں تو ''مومی جگاری'' اسے کہتے ہیں۔ ایک ہزار سال سے بھی پرانی شاعری میں اس تہوار کے تذکرے موجود ہیں۔

آٹھویں صدی عیسوی جسے یہاں ''نارا'' عہد کہتے ہیں، اس زمانے کی شاعری کا یہ محبوب موضوع ہے۔ ہمارے ہاں فیض احمد فیض نے اسی موسم میں لکھی ایک معروف نظم میں پاکستان کو ''زرد پتوں کا بن'' بھی کہا ہے۔ چونکہ مستقل یہاں موسم خزاں کا راج دیکھتے تھے۔ اور قانون کے نفاذ کے حوالے سے اس دیس کو جنگل محسوس کرتے تھے۔ اسی لئے اسے درد کی انجمن بھی لکھتے تھے۔ پسِ دیوار زنداں تحریر کردہ شاعری میں فیض کے کلام کا بہت نمایاں مقام ہے۔

خزاں کا رنگین اور دلکش منظر فقط فطرت کا کرشمہ نہیں ہے۔ ان مناظر کی آبیاری بہت سے نیک دل لوگوں نے کی ہے۔ اس کی ایک مثال ٹویوٹا کمپنی کی وجہ تسمیہ اور گاڑیاں بنانے والے اسی ادارے کے ہم نام شہر میں جو پت جھڑ کا حسین منظر نظر آتا ہے، اس نظارے کا سبب سترہویں صدی عیسوی میں ایک بدھ مت کے پیروکار اور معبد کے مہا پنڈت کے ہاتھوں سے لگائے گئے چار ہزار میپل کے درخت ہیں۔ بدھ عبادت گاہ کے اردگرد کے علاقے میں پروہت کے لگائے گئے درختوں کے پتے خزاں کے موسم میں زمین پر زرد اور نارنجی چادر بچھا دیتے ہیں۔ منظر کا حصہ بننے والے ان ادھ مڑے، زرد، خشک، نارنجی پتوں پر اگر پیدل چل کر دیکھیں تو احساس یہی ہوتا ہے۔ جیسے کسی دبیز قالین پر قدم رکھ رہے ہیں۔

یہاں پر خزاں کا انتخابی نشان باقی دنیا کی طرح میپل کا پتا ہے۔ میپل کو اردو اور فارسی میں ''افرا'' کہتے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ قارئین کی اکثریت کے نزدیک ''افرا'' کی نسبت میپل زیادہ مانوس ہوگا۔ گرچہ آج کل پاکستان سمیت مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں افرا لڑکیوں کا مقبول نام ہے۔ مجھے پروین شاکر کی شاعری سے یہ شکوہ رہتا تھا کہ وہ ان پھولوں اور پیڑوں کے استعارے استعمال کرتی ہے۔ جو ہم نے کبھی دیکھے بھی نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں رات کی رانی کی خوشبو کا تذکرہ ہو یا پھر املتاس کے پیڑ پر لگے پھول، کم از کم میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اسی لیے مجھے شوکمار بٹالوی کا ''شرینہ دا پھل'' کے نام سے شعری مجموعہ دیکھ کر زیادہ اچھا لگتا اور سمجھ بھی آتی تھی۔ مگر واقعہ کچھ یوں ہوا کہ ایک حسین شام ایک باغیچے میں بیٹھے تھے۔ کہ کہیں سے بڑی دل آویز مہک ناک کے نتھنوں سے ٹکرائی تو کسی نے بتایا کہ یہ رات کی رانی کی خوشبو ہے، پچھلے برس لاہور کے ایک رہائشی علاقے میں اہل خانہ کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے، اردگرد لگے درختوں کی بابت پوچھا، جن پر لدے، پھندے، پیلے رنگ کے پھول اپنے حسن سے مبہوت کئے جا رہے تھے۔ پتہ چلا کہ یہ املتاس کے پیڑ ہیں، جن پر بسنتی رنگ کے پھول سجے ہیں۔ اس روز میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کوئی بھی پھول اور پیڑ پرایا نہیں ہوتا۔

پہاڑی جنگلوں میں دور تک نکل جانے والے جاپانی لوگوں کے لئے سرخ اور ادھ مڑے پیلے پتوں کا مطلب، آنے والے تنہائی اور طویل موسم سرما کے دن ہیں۔ یاد رہے کہ شدید سردی اور برفباری کے باعث یہاں کے زیادہ تر علاقوں میں نقل و حرکت محدود ہو جاتی ہے۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں جانا تو خیر ممکن ہی نہیں رہتا ہے۔ سرما کی قید سے پہلے آزادی کے چند دنوں کا یہ جشن ہے۔ مگر حزن اور اداسی کے رنگ واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ تاریخی طور پر فقط مذہبی مقامات کے گرد و نواح میں پت جھڑ سے متعلق محفلیں ہوتی تھیں اور خصوصی عبادات کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ مگر اب مذہبی رنگ اس تہوار میں پھیکا پڑ گیا ہے، اور ثقافتی و سماجی رنگ غالب نظر آتا ہے۔

غزہ کا المیہ اور اسرائیلی مظالم: انسانیت کی چیخیں

انجینئر ظفر محی الدین

دنیا کے نقشے پر اگر کہیں انسانیت کی لاش پڑی ہے تو وہ غزہ کی سرزمین ہے۔ فلسطین اور خصوصاً غزہ آج ایسی بستی کا نام ہے، جہاں انسانوں کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے، جہاں معصوم بچوں کے لاشے کھیل کے میدانوں سے اٹھائے جاتے ہیں، اور جہاں عورتیں اور بزرگ اپنے پیاروں کے کفن تیار کرتے کرتے تھک چکے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ سب کچھ دنیا کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے، لیکن انسانیت کے ٹھیکے دار خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہیں۔

فلسطین کا تنازعہ کوئی آج کا نہیں، یہ ایک طویل اور دردناک داستان ہے جو کئی نسلوں پر محیط ہو چکی ہے۔ 1948ء میں اسرائیل کے ناجائز قیام کے بعد سے فلسطینیوں پر ظلم و ستم کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا، جس میں کبھی شدت آتی ہے اور کبھی بظاہر تھم جاتی ہے، لیکن ختم نہیں ہوتی۔ غزہ، جو فلسطین کا ایک محصور علاقہ ہے، تقریباً دو دہائیوں سے مسلسل اسرائیلی محاصرے میں ہے، جہاں زندگی کے تمام بنیادی وسائل کی قلت ہے، اور انسان محض سانس لینے کو ہی زندگی سمجھ بیٹھے ہیں۔

آج جب ہم قلم اٹھا کر غزہ کی تازہ صورتحال بیان کرنے لگتے ہیں، تو الفاظ بے بس ہو جاتے ہیں۔ حالیہ اسرائیلی حملوں نے غزہ کو کھنڈر میں بدل دیا ہے۔ پوری پوری بستیاں مٹی کا ڈھیر بن چکی ہیں۔ بچوں کی لاشیں ملبے تلے سے نکالی جا رہی ہیں، عورتیں اپنے زخمی بچوں کو اٹھا کر مدد کی دہائی دے رہی ہیں، لیکن کوئی سننے والا نہیں۔ اسپتال بھر چکے ہیں، دوائیں ختم ہو چکی ہیں، اور ڈاکٹر اپنے ہاتھوں میں زندگی بچانے کی طاقت نہ پا کر آنکھوں سے بے بسی کے آنسو بہا رہے ہیں۔

ایک طرف اسرائیلی فوج جدید ترین اسلحہ استعمال کر رہی ہے، دوسری طرف نہتے فلسطینی اپنے گھروں میں قید ہیں۔ نہ ان کے پاس بچاؤ کے ذرائع ہیں، نہ کوئی محفوظ پناہ گاہ۔ اسرائیلی فضائی حملوں اور توپ خانے کی گھن گرج نے غزہ کی فضا کو بارود کی بدبو سے بھر دیا ہے۔

اگر دنیا میں انسانی حقوق کی کوئی شق باقی رہ گئی ہو، تو وہ غزہ کے لوگوں پر لاگو نہیں ہوتی۔ اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کی تنظیمیں محض قراردادوں اور پریس ریلیزوں تک محدود ہیں۔ اسرائیل کھلے عام بین الاقوامی قوانین کی دھجیاں اڑا رہا ہے، لیکن عالمی برادری بے حس بنی ہوئی ہے۔ اسپتالوں پر بمباری، امدادی قافلوں کو نشانہ بنانا، بچوں کے اسکولوں کو تباہ کرنا، یہ سب جنگی جرائم کے زمرے میں آتے ہیں، لیکن اسرائیل کے لیے شاید کوئی قانون نہیں۔

اقوام متحدہ کے ماہرین نے کئی بار اسرائیل پر انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کا الزام لگایا ہے۔ ''ایمنسٹی انٹرنیشنل'' اور ''ہیومن رائٹس واچ'' جیسی تنظیموں نے بھی اپنی رپورٹس میں واضح کیا ہے کہ اسرائیلی حملے جنگی جرائم کے مترادف ہیں، لیکن ان رپورٹس کا کیا فائدہ جب عالمی طاقتیں آنکھیں بند کرلیں؟

غزہ کی موجودہ صورتحال پر دنیا بھر میں غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ مختلف ممالک میں عوامی سطح پر مظاہرے ہو رہے ہیں، لوگ فلسطین کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کر رہے ہیں، لیکن جب بات حکومتی سطح پر آتی ہے تو مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ مسلم دنیا کی اکثریت خاموش تماشائی ہے، اور مغربی ممالک کھل کر اسرائیل کی حمایت کر رہے ہیں۔ امریکہ اور یورپی یونین اسرائیل کو دفاعی حق کا لبادہ اوڑھا کر اسے نہتے فلسطینیوں کا قاتل بنا رہے ہیں۔

ترکی، قطر، ایران اور کچھ دیگر ممالک نے فلسطینی عوام کی حمایت کا برملا اعلان کیا ہے، لیکن مجموعی طور پر مسلم دنیا کی بے حسی شرمناک ہے۔ عرب لیگ اور او آئی سی جیسی تنظیمیں صرف رسمی اجلاس بلانے تک محدود ہیں۔ ان کا کوئی عملی قدم نظر نہیں آتا جو فلسطینیوں کے زخموں پر مرہم رکھ سکے۔

عالمی میڈیا کا رویہ بھی خاصا مایوس کن ہے۔ مغربی میڈیا اسرائیلی بیانیہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے جبکہ فلسطینی مظلوموں کی آواز دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ سوشل میڈیا نے فلسطینیوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم فراہم کر دیا ہے، جہاں وہ اپنی مظلومیت کی داستان دنیا تک پہنچا رہے ہیں۔ نوجوان فلسطینی لڑکے لڑکیاں موبائل فون کے ذریعے تصاویر اور ویڈیوز شیئر کر کے عالمی ضمیر کو جھنجوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہیش ٹیگز کی مہمات، لائیو اپڈیٹس، اور آن گراؤنڈ شہادتیں دنیا کو بتا رہی ہیں کہ غزہ میں نسل کشی ہو رہی ہے، لیکن افسوس کہ مین اسٹریم میڈیا اب بھی اسرائیلی موقف کی ترجمانی میں مصروف ہے۔

سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ایک ارب سے زائد مسلمانوں کی امت اتنی بے بس کیوں ہے؟ او آئی سی کے اجلاس صرف تقاریر اور قراردادوں تک محدود

کیوں رہتے ہیں؟ امت مسلمہ کی یہ بے حسی اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم صرف اپنے مفادات کے اسیر ہو چکے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کے تجارتی معاہدے، سفارتی تعلقات، اور ذاتی مفادات انہیں مظلوم فلسطینیوں کی مدد سے روک رہے ہیں۔

یاد رکھیں! فلسطین صرف فلسطینیوں کا مسئلہ نہیں، یہ پوری امت مسلمہ کا مسئلہ ہے۔ اگر آج ہم نے غزہ کے مظلوموں کا ساتھ نہ دیا تو کل ہمارے دروازے پر بھی ظلم دستک دے گا۔

اسرائیلی حکومت کی موجودہ حکمت عملی داخلی سیاسی بحرانوں سے توجہ ہٹانے کی کوشش بھی ہے۔ اسرائیل کی اندرونی سیاست میں سخت گیر عناصر کا غلبہ بڑھ رہا ہے، اور فلسطین پر حملے ان کے سیاسی مفادات کا حصہ ہیں۔ امریکی حمایت اور مغربی دنیا کی پشت پناہی اسرائیل کو کھل کر مظالم ڈھانے کا موقع فراہم کر رہی ہے۔

فلسطین کی اپنی اندرونی سیاسی تقسیم بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے۔ حماس اور فتح کے درمیان اختلافات نے فلسطینی جدوجہد کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ انتشار فلسطینیوں کے لیے نقصان دہ ہے، کیونکہ اسرائیل اس کا فائدہ اٹھا کر اپنی جارحیت کو جاری رکھتا ہے۔

غزہ میں انسانی المیہ اپنی انتہاؤں کو چھو رہا ہے۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہو چکے ہیں، غذائی قلت اور طبی امداد کی شدید کمی ہے۔ بچوں کے لیے دودھ نہیں، زخمیوں کے لیے دوائیں نہیں، اور ماں کے ہاتھوں میں صرف اپنے بچے کی لاش کا کفن باقی رہ گیا ہے۔

فلسطین کا مستقبل اندھیروں میں ڈوبا نظر آ رہا ہے۔ دو ریاستی حل کی امیدیں دم توڑ چکی ہیں۔ اسرائیلی بستیوں کی توسیع اور فلسطینی علاقوں کا مسلسل قبضہ مستقبل کی کوئی روشن تصویر پیش نہیں کرتا۔ دنیا کو چاہیے کہ فلسطینیوں کے حق خودارادیت کو تسلیم کرے اور انہیں عزت و وقار کے ساتھ جینے کا حق دے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم فلسطین کے لیے آواز بلند کریں۔ کم از کم انسانی ہمدردی کی بنیاد پر ہم ان مظلوموں کا ساتھ دیں۔ جو لوگ مالی مدد کر سکتے ہیں، وہ کریں۔ جو دعائیں کر سکتے ہیں، وہ کریں۔ جو قلم اٹھا سکتے ہیں، وہ خاموش نہ رہیں۔ کیونکہ فلسطین صرف فلسطینیوں کا مسئلہ نہیں، یہ انسانیت کا مسئلہ ہے۔

ہمیں اپنی نسلوں کو یہ پیغام دینا ہے کہ ہم ظالم کے خلاف اور مظلوم کے ساتھ ہیں۔ ہمیں دنیا کو یہ باور کرانا ہے کہ جب تک ایک بھی مظلوم کی چیخ باقی ہے، ہم خاموش نہیں بیٹھیں گے۔

غزہ جل رہا ہے، فلسطین رو رہا ہے، لیکن امید کا چراغ ابھی بجھا نہیں۔ فلسطینی عوام کی استقامت، ان کا حوصلہ، اور ان کی جدوجہد اس بات کا ثبوت ہے کہ ظلم کے سائے جتنے بھی گہرے ہوں، روشنی کا سورج ایک دن ضرور طلوع ہوگا۔ ہمیں فلسطین کے مظلوموں کے ساتھ کھڑا ہونا ہے، چاہے یہ کھڑے ہونا دعا کی صورت میں ہو یا قلم کی صورت میں۔ ہمیں عالمی ضمیر کو جھنجوڑنا ہے، اور دنیا کو بتانا ہے کہ غزہ میں انسانیت قتل ہو رہی ہے۔

اللہ فلسطین کی حفاظت فرمائے، غزہ کو امن نصیب کرے، اور ہمیں حق کے ساتھ کھڑا ہونے کی توفیق دے۔ آمین۔

✦✦✦

جسٹس (ر) میاں نذیر اختر / لاہور

غزہ کی فریاد

وحشی جب بن جائے بندہ
ظلم سے کب شرمائے بندہ
ظالم اور خونخوار بنے تو
صہیونی بن جائے بندہ
حال غزہ کا دیکھ کے روئے
بے بس کیا کر پائے بندہ
صہیونی بے رحم درندہ
پھر وہ کیوں کہلائے بندہ
خون بہا کر معصوموں کا
رب کی پکڑ میں آئے بندہ
ہر صہیونی غاصب قاتل
ایسا ہر مٹ جائے بندہ
ظلم کی رہ پہ چل کے آخر
نار سقر میں جائے بندہ
مِٹ جائے جب غیرت دل سے
ظلم پہ چُپ ہو جائے بندہ
مسلم دنیا مہر بلب ہے
حیراں رہ رہ جائے بندہ
درد کسی کا کب وہ جانے
بے حس جب بن جائے بندہ
اب آزاد فلسطیں ہوگا
ظالم تو مِٹ جائے بندہ
اس پر پھر جو بیتے بیتے
اخترؔ حق کہہ جائے بندہ

✦✦✦

غزہ کا نوحہ

لبنیٰ صفدر/ لاہور

اسرائیلی جارحیت کا یہ ایک برس کم از کم 42 ہزار فلسطینیوں کی شہادت اور غزہ کے شہری ڈھانچے کی مکمل تباہی پر منتج ہوا۔ فسطائیت کی ایسی دوسری مثال چشم فلک نے نہیں دیکھی۔ مگر اہل غزہ سلام کے مستحق ہیں جن کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔

آج پاکستان سمیت تمام باضمیر تو میں عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے اور یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ مشرقِ وسطیٰ میں جنگ کی آگ کو بجھانا عالمی امن کا تقاضا ہے۔ اگر عالمی طاقت فلسطینیوں کا تحفظ کرنے میں ناکام رہی ہے تو مسلم ممالک بھی کوئی ایسا لائحہ عمل ترتیب نہیں دے سکے۔ قطر اور مصر کی کاوشوں سے ایک عارضی جنگ بندی عمل میں آئی مگر چند گھڑیوں کی جنگ بندی مظلوم غزہ واسیوں کے دکھوں کی تلخی کو کم نہیں کر سکی۔ درحقیقت اسرائیل نے اپنے شہریوں کو چھڑانے کے جس ایجنڈے کے تحت جنگ کا آغاز کیا تھا وہ بری طرح ناکام ہو چکا اور یہ ناکامی اسرائیلی کی بڑھتی فسطائیت سے عیاں ہے۔ ہمسایہ ممالک پر بڑھتے حملے عالمی امن کو اسرائیل سے لاحق خطرے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ عالمی امن کو اس ابھرتے خطرے سے صرف اس طرح بچایا جا سکتا ہے کہ اسرائیلی کی بے جا طرفداری کے بجائے انصاف اور انسانی ہمدردی سے کام لیا جائے۔ یہ حقیقت نظر میں رکھنی چاہئے کہ امریکہ اور اسرائیل کے ہتھیاروں کی تجربہ گاہ فلسطین کی سرزمین، ان کے مرد، عورتیں، بچے اور بزرگ یعنی عام لوگ ہیں۔

اسرائیل نے ڈرونز اور جدید مہلک ہتھیار بنانے کے لیے ایک منظم صنعتی ڈھانچہ قائم کر رکھا ہے، جس کا مرکز تو اسرائیل میں واقع ہے، لیکن اس کے کئی ذیلی کارخانے اور شاخیں امریکہ جیسے طاقتور ممالک میں بھی موجود ہیں۔ یہ صرف ہتھیاروں کی پیداوار نہیں، بلکہ ایک عالمی منڈی ہے جہاں یہ اسلحہ نہ صرف فروخت کیا جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ اسرائیلی ادارے یہ ''ضمانت'' بھی فراہم کرتے ہیں کہ یہ ہتھیار میدانِ جنگ میں آزمائے جا چکے ہیں۔ مگر یہ میدانِ جنگ کوئی خالی ریگزار نہیں، بلکہ فلسطین کی مظلوم سرزمین ہے۔ جہاں ان ہتھیاروں کا عملی مظاہرہ انسانی لاشوں، تباہ شدہ گھروں، اور خون آلود گلیوں میں کیا جاتا ہے۔

جی ہاں! یہ ایک تلخ مگر نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ فلسطینی عوام، جن میں معصوم بچے، بے گناہ خواتین، ضعیف العمر بزرگ اور نہتے نوجوان شامل ہیں، ان ہتھیاروں کے "تجربات" کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ ہر دن، ہر رات، غزہ اور مغربی کنارے میں اسرائیلی جارحیت کی صورت میں یہ تجربات جاری ہیں۔ یہ وہی ہتھیار ہیں جو بعد ازاں دنیا بھر کو بیچے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ "فیلڈ ٹیسٹڈ" یعنی جنگ میں کامیابی سے آزمائے گئے ہیں۔

ایسے میں امریکہ کے وہ باہمت اور باضمیر شہری قابلِ تحسین ہیں جنہوں نے بوسٹن میں قائم ایسی ہی اسلحہ ساز فیکٹریوں کے خلاف عملی احتجاج کیا۔ ان لوگوں نے محض نعرے بازی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اپنے جسموں کو زنجیروں سے باندھ کر فیکٹریوں کے داخلی راستوں پر لیٹ گئے۔ انہوں نے اپنے جسموں کو ڈھال بنا کر کہا: "ہم یہ اسلحہ فلسطین کے نہتے لوگوں پر استعمال نہیں ہونے دیں گے۔" ان کی اس پرعزم مزاحمت کے نتیجے میں کئی دنوں تک ان فیکٹریوں کا کام بند رہا، پیداوار رکی رہی، اور عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی ایک کوشش کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

غزہ پٹی میں انسانی المیہ دن بدن شدت اختیار کرتا جا رہا ہے، اور دنیا بھر کی نظریں اس پر مرکوز ہیں کہ عالمی ادارے، خاص طور پر اقوام متحدہ، اس بحران کے حل میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا صرف قراردادیں کافی ہیں؟ یا وقت آ گیا ہے کہ اقوام متحدہ اپنی حدود سے آگے بڑھ کر عملی اقدامات کرے؟

اقوام متحدہ کا قیام 1945 میں ہوا تھا، جس کا مقصد دنیا میں امن قائم رکھنا، انسانی حقوق کا تحفظ کرنا اور اقوام کے درمیان تنازعات کو پرامن طریقے سے حل کرنا تھا۔ فلسطین اور اسرائیل کا تنازع اقوام متحدہ کے ابتدائی چیلنجز میں سے ایک رہا ہے۔ 1947 کی تقسیم کی قرارداد سے لے کر آج تک، اقوام متحدہ نے فلسطین کے حق میں متعدد قراردادیں منظور کی ہیں، جن میں اسرائیل کے قبضے، آبادکاری اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی مذمت کی گئی ہے۔

اکتوبر 2023 کے بعد اسرائیل کی جانب سے غزہ پر حملے، شدید بمباری، محاصرہ، اور انسانی امداد کی بندش نے ایک ناقابل برداشت صورت اختیار کر لی ہے۔ اقوام متحدہ کی مختلف شاخیں جیسے کہ:

UNOCHA (Office for the Coordination of Humanitarian Affairs)

UNRWA (Relief and Works Agency for Palestine Refugees)

UNHRC (Human Rights Council)

سب نے متعدد بار غزہ میں جاری انسانی بحران کو نسل کشی کے قریب" قرار دیا ہے۔ سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی متعدد قراردادیں پیش کی گئیں، جنہیں اکثر امریکہ نے ویٹو کر دیا۔

اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادیں اگر عملی طور پر نافذ نہ کی جائیں تو وہ محض علامتی حیثیت رکھتی ہیں۔ فلسطین کے معاملے میں اقوام متحدہ کی قراردادیں نہ تو اسرائیلی ریاست کو جواب دہ بنا سکی ہیں، نہ ہی فلسطینی عوام کو کسی حقیقی تحفظ یا انصاف کی ضمانت دے سکی ہیں۔

امریکہ اسرائیل کا سب سے بڑا اتحادی ہے، اور اس کی ویٹو پاور اکثر فلسطینیوں کے حق میں قراردادوں کو روک دیتی ہے۔

اقوام متحدہ نے کئی ممالک میں امن فوج بھیجی ہے، مگر غزہ میں کبھی بھی ایسی کوئی موثر امن فورس تعینات نہیں کی گئی۔

اسرائیلی جنگی جرائم پر عالمی سطح پر قانونی کارروائی کی کوششیں بھی اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر بے اثر رہی ہیں۔

جی ہاں، اگر سیاسی عزم ہو تو اقوام متحدہ مندرجہ ذیل اقدامات کے ذریعے کردار ادا کر سکتی ہے:

اقوام متحدہ کو اپنی ایجنسیز کے ذریعے امداد کو اسرائیلی رکاوٹوں کے بغیر غزہ تک پہنچانا چاہیے۔

اسرائیل کے خلاف جنگی جرائم کی تحقیقات اور مقدمات میں اقوام متحدہ کا بھرپور تعاون ضروری ہے۔

اگرچہ یہ ایک مشکل قدم ہے، مگر دنیا کی نظروں میں اقوام متحدہ کی ساکھ بچانے کے لیے یہ ناگزیر ہو چکا ہے۔

اقوام متحدہ کے ڈھانچے میں اصلاحات کر کے ویٹو کی طاقت کو محدود کرنا ایک طویل المدتی لیکن ضروری عمل ہے۔

اقوام متحدہ تمام رکن ممالک کو پابند کر سکتی ہے کہ وہ اسرائیل پر اقتصادی، سفارتی اور سیاسی دباؤ ڈالیں تاکہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں بند کی جاسکیں۔

اقوام متحدہ کے اندر تبدیلی کے لیے عالمی عوامی رائے، مظاہرے، سوشل میڈیا پر مہمات اور سول سوسائٹی کی آواز انتہائی اہم ہے۔ جب دنیا بھر کے لوگ آواز اٹھاتے ہیں تو اداروں پر بھی دباؤ بڑھتا ہے کہ وہ صرف قراردادوں سے آگے بڑھ کر کچھ عملی کریں۔

غزہ آج ایک کھلی جیل بن چکا ہے جہاں بچوں، خواتین، اور عام شہریوں پر بم برسائے جا رہے ہیں۔ اقوام متحدہ اگر واقعی "عالمی ضمیر" ہے، تو اسے اب صرف قراردادوں سے آگے بڑھنا ہوگا۔ امن کی بحالی، انسانی امداد کی فراہمی، اور انصاف کے تقاضے پورے کرنا اقوام متحدہ کی اصل آزمائش ہے۔

غزہ پٹی میں انسانی المیہ دن بدن شدت اختیار کرتا جا رہا ہے، اور دنیا بھر کی نظریں اس پر مرکوز ہیں کہ عالمی ادارے، خاص طور پر اقوام متحدہ، اس بحران کے حل میں کیا کردار ادا کر رہے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا صرف قراردادیں کافی ہیں؟ یا وقت آ گیا ہے کہ اقوام متحدہ اپنی حدود سے آگے بڑھ کر عملی اقدامات کرے؟ اقوام متحدہ کا تاریخی تناظر اقوام متحدہ کا قیام 1945 میں ہوا تھا، جس کا مقصد دنیا میں امن قائم رکھنا، انسانی حقوق کا تحفظ کرنا اور اقوام کے درمیان تنازعات کو پرامن طریقے سے حل کرنا تھا۔ فلسطین اور اسرائیل کا تنازع اقوام متحدہ کے ابتدائی چیلنجز میں سے ایک رہا ہے۔ اقوام متحدہ کی مختلف شاخیں سب نے متعدد بار غزہ میں جاری انسانی بحران کو نسل کشی کے قریب" قرار دیا ہے۔ سلامتی کونسل میں جنگ بنہ؟) کی متعدد قراردادیں پیش کی گئیں، جنہیں اکثر امریکہ نے ویٹو کر دیا۔ اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادیں اگر عملی طور پر نافذ نہ کی جائیں تو وہ محض علامتی حیثیت رکھتی ہیں۔ فلسطین کے معاملے میں اقوام متحدہ کی قراردادیں نہ تو اسرائیلی ریاست کو جواب دہ بنا سکی ہیں، نہ ہی فلسطینی عوام کو کسی حقیقی تحفظ یا انصاف کی ضمانت دے سکی ہیں۔ امریکہ اسرائیل کا سب سے بڑا اتحادی ہے، اور اس کی ویٹو پاور اکثر فلسطینیوں کے حق میں قراردادوں امن فوج کی غیر موجودگی اقوام متحدہ نے کئی ممالک میں امن فوج بھیجی ہے، مگر غزہ میں کبھی بھی ایسی کوئی موثر امن فورس تعینات نہیں کی گئی۔ قانونی کارروائی کی کمی اسرائیلی جنگی جرائم پر عالمی سطح پر قانونی کارروائی کی کوششیں بھی اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر بے اثر رہی ہیں۔ کیا اقوام متحدہ کچھ کر سکتی ہے؟ جی ہاں، اگر سیاسی عزم ہو تو اقوام متحدہ مندرجہ ذیل اقدامات کے ذریعے کردار ادا کرے۔

(1) انسانی امداد کی فوری اور اقوام متحدہ کو اپنی ایجنسیز کے ذریع امداد کو اسرائیلی رکاوٹوں کے بغیر غزہ تک پہنچانا چاہیے۔ انٹرنیشنل کریمنل کے خلاف جنگی جرائم کی تحقیقات اور مقدمات میں اقوام متحدہ کا بھرپور تعاون ضروری ہے۔ اگرچہ یہ ایک مشکل قدم ہے، مگر دنیا کی نظروں میں اقوام متحدہ کی ساکھ بچانے کے لیے یہ ناگزیر ہو چکا ہے۔ ویٹو پاور میں اقوام متحدہ کے ڈھانچے میں اصلاحات کر کے ویٹو کی طاقت کو محدود کرنا ایک طویل المدتی لیکن ضروری عمل ہے۔ اقوام متحدہ تمام رکن ممالک کو پابند کر سکتی ہے کہ وہ اسرائیل پر اقتصادی، سفارتی اور سیاسی دباؤ ڈالیں تاکہ انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں بند کی جاسکیں۔ عوامی دباؤ اور سول سوسائٹی کا کردار اقوام متحدہ کے اندر تبدیلی کے لیے عالمی عوامی رائے، مظاہرے، سوشل میڈیا پر مہمات اور سول سوسائٹی کی آواز انتہائی اہم ہے۔ اقوام متحدہ جو عالمی امن کا ضامن ادارہ ہے۔ مشرقِ وسطیٰ سمیت پوری دنیا کا پُرامن اور پائیدار مستقبل دیرینہ تصفیوں کے حل میں مضمر ہے۔ مسئلہ فلسطین کا مستقل حل ہی دنیا کو مزید تقسیم اور عدم استحکام سے روک سکتا ہے۔

جنید آذر/اسلام آباد

غزہ کی فریاد

کوئی تو ظالم کا ہاتھ روکے
کوئی تو بہتے ہوئے لہو کا فرات روکے
کوئی تو وحشت کے سلسلے کو لگام ڈالے
کوئی تو نوخیز پھول کلیوں کا قتل روکے!
وہ زندگی جو محاصرے میں پڑی ہوئی ہے
فضا ہے جس پر مسلسل آتش برس رہی ہے
تمام منظر لہو میں تر ہے،
کہیں کسی کو اماں نہیں ہے،
اماں ہو کیسے، کہیں کوئی سائباں نہیں ہے
کسی سماعت میں ادھڑے جسموں کا نوحہ اترے
تو شاید اس کا ضمیر جاگے!!!
مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے؟
یہاں تو ہر اک کو اپنی اپنی پڑی ہوئی ہے
لگی ہوئی ہے لبوں مہرِ سکوت سب کے
کسے غرض ہے کہ حق و باطل کی بات چھیڑے
ہر اک کسی مصلحت میں چپ ہے!
فضائے اقصیٰ کسی ایوبی کی منتظر ہے!!!!
کہاں ہیں انسانیت کے نعرے لگانے والے
کہاں ہیں دنیا میں امن کے گیت گانے والے
کہاں ہیں عالم میں منصفی کا عظیم دعویٰ کرنے والے
کہیں بھی دانش کدوں میں ہلچل بپا نہیں ہے
یہ لگ رہا ہے کہ جیسے کچھ بھی ہوا نہیں ہے
کسی کے دل میں ذرا بھی خوفِ خدا نہیں ہے!

عامر سہیل/بہاولنگر

گھر فلسطین کے ڈھاتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے
ہاتھ اُردن پہ اُٹھاتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے
جب پھٹے دودھ کے چہرے کسی جم خانے سے
دور مشرق کی ہلاتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے
ربِ یوسف کی قسم، ربِ زلیخا کی قسم
زخم انجیل سناتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے
یہ حلب حوض ہوا کرتا تھا جل پریوں کا
اس کا افسوس مناتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے
ایسا برباد کہ رب سے نہیں دیکھا جاتا
خیمۂ حسن میں آتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے
گیلی فجریں بھی انہیں معاف نہیں کرنے کی
خوف آنتوں میں بجھاتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے
ہے ہے یہ موسیٰ و عیسیٰ کا علاقہ عامرؔ
اولیاء گشت پہ آتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے
جو خُدا بیچنے آتے ہیں خداوندا وہ!
وہ بھی مخلوق کہاتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے
کوئی نن گرجے میں عیسیٰ کی گواہی رکھے
پادری رحل چراتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے
یہ یہود اور ہنود اور کرسچن عامرؔ!
چاند مٹی میں مِلاتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے
عشق اور سورۂ احزاب کے حافظ عامرؔ
نُور آنکھوں کا گنواتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے
یہ پرندے ہیں کہ لبنان کی آنکھیں عامرؔ
گھر کا احوال سناتے ہیں تو دکھ ہوتا ہے

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

کہیں ہے خون کی ہولی، کہیں پر گل برستے ہیں
اُڑانیں جن سے چھینی تھیں وہ بادل پھر گرجتے ہیں
ملی ہے ڈھیل تھوڑی سی تو دنیا کو جلا ڈالا
کہاں ڈھونڈیں وہ اپنوں کو جو سانسوں کو ترستے ہیں
فضا بھی سرخ ہوتی ہے جہاں معصوم کٹتے ہوں
جہاں ہو زعم طاقت کا وہاں جذبے سسکتے ہیں
یہ انسانی حقوق اب تک تو اوروں پر ہی لاگو ہیں
جب اپنی بات آتی ہے تو چپکے سے کھسکتے ہیں
زمانے کی ہواؤں میں تعفن ہی تعفن ہے
کہ ظالم دور کی آنکھوں میں بچے بھی کھٹکتے ہیں

غزہ/فلسطین کے نام

شہزاد دیپ/جھنگ

جہاں زرخیز مٹی میں گلِ لالہ اُگانے ہوں
جہاں بچوں نے روٹھے تتلیاں جگنو منانے ہوں
جہاں پہ پھول سے معصوم چہرے مسکرانے ہوں
جہاں پہ مور، چڑیا اور بلبل چہچہانے ہوں
جہاں کی وادیوں میں کہکشاں سے رہ بنانے ہوں
جہاں سنسان اُجڑے دل کے آنگن پھر بسانے ہوں
جہاں مقصود ہو کہ آشیاں آباد کرنے ہیں
یا پھر ایسا گماں ہو کہ یہاں قدسی اُترنے ہیں
جہاں افلاک کی مانند تارے آ بکھرنے ہوں
یا پھر آ کر بہاروں نے گلابی رنگ بھرنے ہوں
وہاں پھر آگ کے دریا بہائے تو نہیں جاتے
وہاں بارود کے شعلے گرائے تو نہیں جاتے
وہاں کی مسجدیں، مندر، کلیسے، گردوارے، درسگاہیں
اور شفاخانے مٹائے تو نہیں جاتے
وہاں کے بے گناہ شہری، بہت ارزاں سمجھ کر
خوب کاٹے اور اُڑائے تو نہیں جاتے
وہاں پہ کشت و خون اور دھوئیں کے روسیاہ بادل
اُٹھائے تو نہیں جاتے
وہاں جنگ و جدل کے حشر پرور آتشی میلے لگائے تو
نہیں جاتے
جہاں زرخیز مٹی میں گلِ لالہ اُگانے ہوں
جہاں بچوں نے روٹھے تتلیاں جگنو منانے ہوں

سفید گلاب

بلقیس ریاض

پام کے درخت جھوم رہے تھے۔ ہوائیں درختوں کے پتوں کو چوم رہی تھیں۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی تھیں۔ چار سو خاموشی چھائی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی اس ویرانے میں اُتر رہی تھی۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اس خاموشی کو چیرتے ہوئے اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اکثر اس کے ساتھ سیڑھیوں پر بیٹھ کر چاند کی روشنی میں اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر کہتی ''تم جا تو رہے ہو لیکن میں تمہاری بے وفائی برداشت نہیں کر پاؤں گی...... وعدہ کرو تم وفادار رہو گے۔''

''کیسی بات کرتی ہو۔ میں نے سچے دل سے تم سے پیار کیا ہے۔ میری زندگی میں تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں آسکتا۔''

''سچ...... لیکن میں بہت خوف زدہ ہوں۔ نہ جانے میرے دل میں اطمینان کیوں نہیں ہے۔''

''تمہیں تو بس وہی ہو گیا ہے کہ میں وفا نہیں کروں گا لیکن ایک بات اچھی طرح جان لو۔ میں مر کر بھی بے وفائی نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے اس کے کندھے سے سر اُٹھاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکتی تو وہاں محبت ہی محبت دکھائی دیتی۔ وہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ شہزاد ثانیہ کا تایازاد بھائی تھا جو ایل ایل بی کرنے کے لیے لندن جا رہا تھا۔ ان دونوں کی باقاعدہ ہاں ہو چکی تھی۔ ان کے والدین چاہتے تھے کہ دونوں کی شادی کر دیں تاکہ شہزاد باہر کی دنیا میں کسی اور کے ساتھ مراسم پیدا نہ کرے۔ مگر چچا زمان نے حامی نہیں بھری تھی۔ ثانیہ کے بارے میں ہی سوچے گا۔ لہٰذا ایک سال کی کوئی بات نہیں دھوم دھام سے شادی کریں گے۔ بھائی بھی لاجواب ہو گیا اور شہزاد باہر کی دنیا میں سدھار گیا۔

موبائل کے ذریعے دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔ میسجز کرتے اور ثانیہ ہر وقت کہتی کب آؤ گے؟ وہ جواب دیتا بس چھ ماہ رہ گئے ہیں اور پھر انتظار کی گھڑیاں ختم ہو جائیں گی اور ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔

ثانیہ شام کے وقت باغ میں بیٹھی شہزاد کی یاد میں اُداس ہو رہی تھی۔ بہار کا موسم اپنے جوبن پر تھا اور ہر رنگ کے پھول اس کے اردگرد کھلے ہوئے مسکراتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ثانیہ نے اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹکا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک پیچھے سے کسی نے اپنے ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیے۔ ثانیہ ہڑبڑا گئی۔

''کون؟''

''بوجھو تو جانو۔''

''کون'' اس نے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی تو کسی نے مضبوطی سے آنکھوں کے اوپر ہی رکھے۔

''پلیز...... ہاتھ ہٹائیں۔''

''نہیں پہچانا۔''

''نہیں......''

چلو دیکھ کر تو پہچان لو گی۔ وہ اس کے سامنے آ گیا۔

''راحیل...... تم''

''جی جناب! ایک ہفتہ کے لیے میں لاہور آیا ہوں مگر ماموں جان نے زبردستی مجھے کہا کہ تم نے ہمارے ساتھ ایک ہفتہ گزارنا ہے۔ تو مان گیا۔ جانتی ہو کیوں؟''

''کیوں؟''

''بھئی تمہارے ساتھ وقت گزارنا چاہتا ہوں...... بچپن کے دن ابھی تک نہیں بھولا۔ چھٹیوں میں یاد ہے جھولے پر لڑائی ہوتی تھی۔ اب سامنے خالی جھولا خاموش ہوا کے ہلکوروں سے ہل رہا ہے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا ہے کہ پہلے کون بیٹھتا ہے۔''

''راحیل...... تم ابھی تک اتنے باتونی ہو۔ یہ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔''

''ثانیہ...... ہم لوگ تو باہر چلے گئے مگر پرانی باتیں ابھی تک نہیں بھولا۔'' یہ شہزاد نظر نہیں آ رہا۔

''وہ لندن چلا گیا ہے...... ایل ایل ایم کرنے۔''

''واہ...... کیا بات ہے؟''

''اور تم......؟''

''میں امریکہ کے ہسپتال میں سرجن ہوں۔ سب کچھ بھول گیا۔ غرض کہ آپس کی لڑائیاں بھی۔ مگر ثانیہ میں تمہیں نہیں بھول پایا۔ بچپن کی یادیں سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گیا ہوں۔''

''اچھا''

''جی...... جناب!''

''جانتی ہو ماما کو میری شادی کی بہت ہی فکر ہے مگر میں......''

''ہاں تم...... کوئی لڑکی نہیں ملی کیا؟''

ثانیہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مردانہ حسن کا شاہکار۔ نہایت ہی ہینڈسم...... اپنی پرکشش آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ثانیہ ایک دم سے شرما

سی گئی اور دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ یہ کتنا بدل گیا ہے۔ جانے سے پہلے تو اتنا ہینڈسم نہیں تھا۔

''شادی کے لیے ماما لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں......اور میں۔''

''کہو۔''

''تمہارے سوا کسی کو نہیں چاہتا۔ وقت آ گیا ہے کہ میں اعتراف کرلوں۔ مجھے بے انتہا محبت ہے ......بولو......شادی کروگی مجھ سے؟''

ثانیہ ٹکر ٹکر اس کی جانب دیکھ رہی تھی اور زور زور سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ خاموش اس کی نگاہ سفید گلاب کے پھولوں کی طرف اُٹھ گئی۔ راحیل سفید گلاب کا پھول توڑ کر ہمیشہ اس کو دیتا۔ ثانیہ اس کی والہانہ نگاہوں میں اس کی محبت دیکھ رہی تھی۔ شہزاد اس وقت اس کے دل میں نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ جیسے اس دنیا میں اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس وقت اس کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو کیا جواب دے۔

بولو ثانیہ''

''کیا......؟'' ثانیہ نے خالی خالی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔

''راحیل......! تمہاری ماما نے نہیں بتایا شہزاد کا رشتہ میرے لیے آیا ہے؟''

''لیکن نہ تو منگنی ہوئی اور نہ شادی۔''

ثانیہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اور ثانیہ سوچ رہی تھی۔ ماضی کی یادیں ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ گئیں۔ جاتے وقت اس نے کہا تھا...... ثانیہ میں جب کچھ بن جاؤں گا تو پھر آؤں گا۔ تم میرا انتظار کرنا۔ میں ضرور آؤں گا۔ وہ ہنس پڑی باہر جانے والے کبھی نہیں آتے۔

کچھ عرصہ تو اس کی باتوں کو یاد کرتی رہی مگر شہزاد کا جب آمنا سامنا ہوتا تو محسوس کرتی یہ بھی محبت کرتا ہے۔ راحیل باہر کی دنیا میں گم سا ہو گیا۔ اپنے کیریئر کو بنانے میں مصروف رہا...... اور اس دوران شہزاد کی محبت پروان چڑھنے لگی۔ شہزاد نے اسے پرپوز کیا تو وہ خاموش سی ہو گئی۔

شہزاد اس وقت باہر کی دنیا میں چلا گیا۔ مگر جاتے جاتے کہہ گیا مجھے بھول نہ جانا اور میرا انتظار کرنا۔

لیکن جب راحیل آیا تو بے چین رہنے لگی۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ شہزاد آنکھوں سے ایسا اوجھل ہوا کہ یوں لگنے لگا کہ اس کی زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔

وہ راحیل کو وقت دے رہی تھی۔ صرف ایک ہفتہ کے لیے آیا تھا۔

ماں کے لیے کچھ چیزیں خریدنی تھیں۔ وہ ثانیہ کے ساتھ مال میں خریداری کر رہا تھا اور جب متعلقہ چیزیں خرید لیں تو دونوں مال کے ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہے تھے۔

''ثانیہ!!''

''ہونہہ''

جانتی ہو تمہیں دنیا دیکھنے کا کتنا شوق تھا۔ تو جب بھی چھٹیاں ہوتی ہیں میں کبھی یورپ اور کبھی کینیڈا کے شہروں میں ضرور ہوتا ہوں اور تمہیں یاد کرتا کیونکہ تمہیں باہر کی دنیا دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔ اب میں بہت سیٹ ہو گیا ہوں۔ زندگی میں بہت عیش و آرام کے ساتھ تمہیں رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے والدین سے الگ بڑا خوبصورت گھر تمہارے لیے بنایا ہے۔ جہاں صرف تم اور میں رہیں گے۔ کوئی دوسرا ہماری زندگی میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ ثانیہ کو یوں لگنے لگا جیسے وہ ہواؤں میں اُڑ رہی ہے اور انجانے میں ہی وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی زندگی میں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

پھر سوچنے لگی تائی کا پارہ ہمیشہ ساتویں آسمان پر رہتا۔ پڑھی لکھی نہ ہونے کی وجہ سے جو منہ میں آتا بول دیتی۔ شہزاد کو تو وہ برداشت کر سکتی تھی مگر گھر کا ماحول اُسے پسند نہیں تھا۔ باپ نے اس کی منگنی نہیں کی تھی زبانی ہاں کر دی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ راحیل کو کیا جواب دے۔ اسے خاموش پا کر راحیل نے پکارا۔

''ثانیہ!!''

ثانیہ نے جھکی آنکھیں اُوپر اُٹھائیں تو راحیل کی آنکھوں کی کشش اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس کا جی چاہنے لگا کاش! سب کچھ اپنے آپ ہی اچھا ہو جائے۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ اس وقت وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ شہزاد بھی باہر کی دنیا میں چلا گیا ہے اور وعدہ کر کے گیا ہے کہ میں باوفا رہوں گا لیکن اتنا کچھ تو وہ میرے لیے نہیں کر سکتا۔

ثانیہ! راحیل نے پھر پکارا۔ تو آنکھوں میں چھپے آنسو سیلاب کی صورت میں بہنے لگے۔ راحیل اس کی کیفیت دیکھ کر آگے بڑھا۔ اپنے ہاتھوں کے پوروں سے اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ وہ آہستگی سے بولی۔

''میں بہت مجبور ہوں......اور''

''اور کیا؟''

''میں بھی آرام اور سکون کی زندگی جینا چاہتی ہوں۔''

''پھر انکار کر دو۔''

''انکار میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں اپنے والدین کو ناراض نہیں کر سکتی۔ میں مشرقی لڑکی ہوں ان کو کوئی دکھ نہیں دے سکتی۔''

گھر پہنچ کر وہ بہت دکھی ہو رہی تھی۔ ماں نے

CamScanner

اس کی کیفیت دیکھی تو پریشان ہوگئی۔

پوچھا ''کیا بات ہے؟ تمہارا چہرہ کیوں مرجھایا ہوا ہے؟''

''ماما! تائی جان کی طبیعت تو آپ جانتی ہیں۔ ایک ہی گھر میں رہ کر روز چخ چخ بک بک ہوتی ہے۔''

''مگر شہزاد اچھا لڑکا ہے تمہیں خوش رکھے گا۔ تم اسے چاہتی بھی ہو۔''

''ایسی ماں کے ہوتے کہاں خوش رکھے گا۔''

''علیحدہ بھی ہو سکتا ہے۔''

تائی جان کہہ تو رہی تھی ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔ ماما میں بہت پریشان ہوں۔ شادی کے بعد علیحدہ گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اپنی سہیلی عاشی کو فون کر کے ساری حقیقت بتائی اور کہا پلیز! تم ہی کوئی رائے دے دو۔

عاشی نے جواب دیا ''کمال ہے...... اتنا اچھا مستقبل اللہ نے سامنے رکھا ہے۔ اتنی عیش اور دنیا کی سیریں تم کرو گی اور والدین تمہیں نہیں دیکھ سکتے۔ آپس میں بڑوں کی لڑائی ہوتی ہے۔ شہزاد تمہارا خیال ہو سکتا ہے اچھا رکھے مگر جوائنٹ فیملی میں رہنا آگ کا دریا عبور کرنے والی بات ہے۔ مجھ سے پوچھو میں کس طرح گزارا کرتی ہوں۔ ایک نند سسرال سے آتی ہے اور دوسری آن کر میرے سر پر چڑھ جاتی ہے۔ سب شوہر اپنے والدین کے تابع ہوتے ہیں۔'' ثانیہ یہ سن کر بے حد پریشان ہوگئی۔

تو عاشی نے کہا ''میں نے جو غلطی کر لی ہے وہ تم نہ کرنا۔ جوائنٹ فیملی میں رہنا عذاب ہے۔''

شام کے وقت وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کھولنے ہی والی تھی کہ راحیل اس کے کمرے میں آ گیا۔

''ثانیہ! باہر چلتے ہیں۔ مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''لیکن''

''لیکن...... ویکن کچھ نہیں۔ تمہارے پاپا نے اجازت دے دی ہے۔''

''اچھا...!'' ثانیہ نے اس کی جانب دیکھا تو وہ آنکھوں پر مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔

''میں چینج کر کے آتی ہوں۔''

وہ لاؤنج میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

ثانیہ جلد ہی لباس چینج کر کے آ گئی۔ وہ دونوں کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ راحیل نے کافی آرڈر کی اور ثانیہ سے پوچھا۔

''ثانیہ سچ سچ بتاؤ تم نے کبھی مجھے یاد کیا تھا؟''

راحیل سے سوال سے وہ گھبرا سی گئی۔ کیسے کہتی کہ شہزاد سے اس کی ہاں ہوئی ہے تو بے اختیار اس کا جی کرنے لگا تھا کہ کاش راحیل کا رشتہ میرے لیے آتا۔

''بولو''

''کیا تھا۔ مگر تم نے بھی جا کر مجھ سے رابطہ نہیں رکھا تھا۔ ان حالات میں اگر میں ہاں کرتی ہوں تو دونوں بھائیوں کی لڑائی ہو جائے گی۔ میں ان کو دکھ نہیں دینا چاہتی۔''

بھائی...... بھائی ہوتا ہے۔ وہ لڑ کر بھی ایک دن مل جائیں گے اور تمہاری تائی جان تو ویسے ہی تمہیں پسند نہیں کرتیں۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''بچپن سے جانتا ہوں۔''

ثانیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''اچھا...... پھر پھپھو جان میرے پاپا سے بات کریں۔''

''ہاں پلیز آگے بولو۔''

''مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔'' لیکن ساری عمر تم نے وفادار رہنا ہوگا۔ واپس آ کر ماں سے کہہ دیا کہ میں صرف اور صرف راحیل سے شادی کروں گی۔ پھپھو جان رشتہ مانگیں تو ہاں کر دیں۔ مجھے راحیل پسند ہے۔ ماں ہکی بکی رہ گئی۔

''ماما...... وہ میرا عندیہ لینے کے لیے اتنی دور سے آیا ہے۔ انکار نہ کیجیے گا۔ میں اچھی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ شہزاد تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ میں نندوں کی خدمتیں اور جوائنٹ فیملی میں نہیں رہنا چاہتی۔ ساری زندگی آپ نے بہت دکھ اُٹھائے ہیں۔ شہزاد کے ساتھ ابھی زبانی ہاں ہی ہوئی ہے لیکن منگنی تو نہیں ہوئی۔ تائی جان نے آئندہ زندگی میں میرا جینا حرام کر دینا ہے۔ میں بچپن سے ہی راحیل کو اچھا انسان سمجھتی تھی۔ اس سے شادی کر دیں میری خوشی کی خاطر۔

میں سوچتی رہی۔ پھر اسے خیال آیا۔ وہ بیٹی کی خوشیوں کے لیے سسرال سے نہیں ڈرے گی۔

ثانیہ کے والدین شش و پنج میں مبتلا تھے کہ بھائی اس سے ناطہ نہ توڑ دے۔

ثریا بیگم راحیل کی والدہ نے اپنے بھائی کو کہا جب بچے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو انکار کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے ثانیہ بہت خوش رہے گی۔

ثانیہ کے والد نے بڑا سوچ سمجھ کر ہاں کر دی۔

ثانیہ نے کمرے میں جا کر اپنی سہیلی کو فون کیا۔

میری ماں نے ساری زندگی بہت دکھ اُٹھائے تھے۔ تائی جان نے قدم قدم پر انہیں ذلیل کیا تھا اور میں نے...... تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ قسمت اعلیٰ بنانے والی تو اللہ کی ذات ہے۔ وہی نیکی اور محبت کے جذبات اُبھارتا ہے۔ ایک اچھا راستہ چننے کے لیے اللہ ہی مدد کرتا ہے۔ مجھے اپنی زندگی پر اختیار ہے۔ دونوں میں جسے چاہوں چن لوں۔ میں نے راحیل کو اپنا جیون ساتھی چن لیا ہے۔

CS CamScanner

سیاہ خیمے کی نحوست

کلیم خارجی/مردان

ریت پر قلابازیاں لگاتے پندرہ بیس بچوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ پانچ سال سے بارہ سال تک بچوں نے صحرا میں نعروں اور بے ہنگم آوازوں کا طوفان مچا رکھا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے انہوں نے آپس میں قافلے کے مسافروں اور ڈاکوؤں کا انداز بنا کر لوٹ مار اور قتل و غارت کا کھیل کھیلا تھا۔ پھر سب نے اپنا اپنا کردار نبھانے کے بعد تھک کر ریت پر لوٹیاں مارنا اور سینے کے بل سے پھسلنا شروع کر دیا تھا۔ صبح ریت کے گرم ہونے سے پہلے وہ روزانہ ہی کھیل اور کرتب کر کے اپنی ذہنی اور جسمانی ورزش کر کے خود کو بہلانے رکھتے۔ اس کے بعد سورج کے ڈوبتے ہی وہ دوبارہ اکٹھے ہو کر ریت پر نمودار ہو جاتے۔ اور گرم ریت کو اُلٹا کر ہوا میں اچھال کر ٹھنڈی ریت میں دبک جاتے تو ان پر حملہ ہو جاتا۔ حملہ آور بچے چیخ چیخ کر انہیں ٹھنڈی ریت سے نکال کر خود وہاں قبضہ کر کے لیٹنے اور ستانے کی کوشش کرتے۔ اندھیرا ہونے لگتا تو ان کی مائیں یا بوڑھے بزرگ ہاتھوں میں لاٹھیاں لے کر انہیں ہانکتے ہوئے اور ڈراتے ہوئے واپس اپنی بستی کی طرف لے جاتے۔

ایک روز صبح جب بچوں کا یہ گروہ ریت پہ نمودار ہوا تو اُنہیں دور ایک سیاہ رنگ کا خیمہ نظر آیا۔ وہ حیرت اور خوشی مین پہلے تو اس سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ خیمہ ان سے بہت دور تھا لیکن اُنہوں نے آپس میں اتفاق کر کے اس تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا۔ بے خوفی، حملے میں پہل چیخ و پکار اور جسمانی تشدد کی مشقوں اور اپنے خاندان کے مردوں کی تمام خصلتوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے وہ سب بے خوف، نڈر اور مہم جو بن گئے سب نے ایک نعرہ بلند کیا اور خیمے کی طرف دوڑنا شروع کیا۔ خیمہ ان کے اندازے سے بہت دور تھا لیکن وہ دوڑتے رہے۔ اور جیسے جیسے فاصلہ کم ہوتا رہا۔ ان کی آواز صحرا کی گرم خاموشی میں گم ہوتی گئی۔ ان کے ریت اچھالتے پاؤں ٹھہر ٹھہر کے آگے بڑھتے رہے۔ خیمہ واقعی سیاہ تھا۔ اور یہ ریت پہ صحیح سالم نصب تھا۔ اتنا بڑا خیمہ اُنہوں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ خیمے کے اردگرد سیاہ اور گول پتھر رکھتے ہوئے تھے۔ اور درمیان سے یہ کسی بڑے بانس کے سہارے فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ سب خیمے کے گرد دائرہ بنا کر لیٹ گئے طاقتوز اور نڈر لڑکوں نے خیمہ کی تہہ سے پتھر ہٹا کر اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ تو انہیں کچھ سمجھائی نہیں دیا۔ لیکن اُنہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ خیمہ اندر کوئی موجود نہیں جوش اور فتح مندی کے ساتھ ایک بڑے سے لڑکے نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر رینگتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے سب اندر داخل ہو گئے۔ دھوپ تیز ہو چکی تھی لیکن خیمے کے اندر شام کا منظر اور ٹھنڈک محسوس کر کے وہ سب اپنی دریافت پر چہکتے ہوئے ریت پر بیٹھ گئے۔ کچھ بچے ریت پہ لیٹ کر خیمہ کے بارے میں تبصرہ کرنے لگے۔ ایک آواز آئی یہ خیمہ شاید بہت پہلے سے یہاں موجود تھا۔ لیکن ہم نے آج اُسے دیکھا ہے خیمہ بہت اچھا وسیع اور مضبوط ہے دوسرے نے کہا اگر کوئی اس کا مالک نہ ہوا تو ہم اسے لپیٹ کر لے جائیں گے۔ یا خیمہ شاید ستانے یا انتظار کرنے کے لیے نصب کیا گیا ہے۔ تیسرے نے کہا یہ خیمہ ڈاکوؤں، قاتلوں یا جنوں کا بھی تو ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے وسط میں جو یہ لمبا سا ستون ہے۔ یہ ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا یہ بہت پراسرار اور خوفناک ہے بہت دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ دائرے میں بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے لڑکوں اور بچوں میں ہلکا ہلکا خوف اترنے لگا۔ ایک موٹی موٹی سبز آنکھوں والے لڑکے نے سب سے چھپ کر ریت پر منہ رکھ کر خوفناک آواز نکالی۔ اور پھر خود ہی سہم کر لرزتے ہوئے بولا، یہ آواز کیسی تھی ایک زخمی لڑکا روتے ہوئے بولا، میں کل پانی کے گھڑے پر گر پڑا تو مجھے چہرے اور آنکھ پر چوٹ لگی میں مزید کسی مشکل کا سامنا کرنے کے قابل نہیں۔ میں اب تھک سا گیا ہوں۔ وہ خاموش ہوا تو خیمے کے اندر بڑھتے ہوئے اندھیرے میں کسی نے لمبی سی ہوک لگائی۔ اور پھر چند چیخیں گونجی سب نے خیمے سے باہر نکلنے کی جدوجہد شروع کی۔ جن لوگوں کو باہر نکلنے کا راستہ ڈھونڈنے میں دشواری ہونے لگی تو اُنہوں نے گھبراہٹ میں ممیانا شروع کر دیا ایک بڑے سے لم ڈھینگ لڑکے کو راستہ مل گیا۔ اُس نے باہر منہ نکال کے دیکھا تو خوف سے لرزتے ہوئے بولا، جلدی جلدی نکلو، باہر اندھیرا ہو چکا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کے بغیر جو بھی باہر نکلتا وہ چیختے ہوئے سامنے کی طرف دوڑ پڑا۔ اپنی جھونپڑیوں کی لو دیکھ کر وہ بھاگتے رہے۔ ڈرتے، ہانپتے جھونپڑیوں میں گھس کر ماؤں اور بزرگوں کے پہلو میں لیٹ کر وہ خیمہ متعلق خوفناک باتیں سناتے سناتے سو گئے۔ صبح ہوئی تو جھونپڑیوں کی بستی میں پراسرار خیمے کی کہانی پھیل چکی تھی۔

تین دن بعد جب سورما ابی عنتے اپنی بستی میں لوٹا تو وہ بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ اپنی خاص جھونپڑی سے برآمد ہوا تو وہ ہشاش بشاش تھا۔ وہ سخت مزاج، ظالم اور موقع پرست ہونے کے ساتھ اپنی بستی کے تمام

مردوں سے مضبوط، طاقتور اور مکار تھا۔ اپنے ساتھ لائی ہوئی تمام چیزیں اپنی بیویوں کے حوالے کر کے وہ اپنے چچا زاد بھائی متولی کی۔ جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی بولا میرے بھائی میرے ساتھ مہم پر جانے والے لوگ آدھے راستے سے واپس لوٹ آئے تھے۔ مجھے انکی نیت پر شبہ ہے۔ کہ اُنہوں نے مجھے جاہل رکھ کر کوئی بہت بڑی واردات کی ہے۔ متولی اسکی دھمکی امیز گفتگو سن کر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اور اپنی صفائی دیتے ہوئے بولا مجھے تو تم خود ہی اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کے لیے چھوڑ گئے تھے حالانکہ میں تمہارے ساتھ جانا چاہتا تھا کہ تم اکثر لوٹے ہوئے مال کی تقسیم میں بددیانتی کرتے ہو۔

میں تمہاری بات نہیں کر رہا ہوں۔ ابی علتے رعب سے غراتے ہوئے بولا، تمہیں پتہ ہے نا بچوں نے ایک بہت بڑا سیاہ خیمہ دیکھ لیا تھا۔ پھر وہ بھاگ آئے ۔اور اُنہوں نے یہاں موجود لوگوں کو اسکی اطلاع دی۔ تم جانتے ہو کہ اس قسم کے خیموں کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ متولی منہ بند کیے۔ رنج اور شکوے سے ابی علتے کو گھورتا رہ گیا۔ لیکن امی غصے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا بے شک یہ خیمے پراسرار ہوتے ہیں۔ لیکن دلیر اور نڈر لوگوں کے لیے نہیں۔ مجھے یقین ہے اس خیمے کے اندر ریت میں دبے ہوئے خزانے ہوں گے ۔ جنہیں تمہارے سوا سب نے ڈھونڈ لیا ہوگا۔ اس لیے میں بستی سے موجود مردوں کو للکارنے والا ہوں۔ کیونکہ جن لڑکوں نے خیمہ دریافت کیا تھا۔ وہ میرے اور تمہارے بچوں سے طاقت اور قد وقامت میں بڑے بلکہ جوان ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم میں موجود سارے حاسدوں نے اس موقع سے بھی فائدہ اُٹھالیا ہے۔ وہ چپکے سے نکل کر خیمے کی طرف پہلے گئے ہوں گے ۔اور اُنہوں نے وہاں پھنسے ہوئے خزانے وغیرہ سمیٹ لیے ہوں گے ۔ ابی علتے کی بات سن کر متولی طیش میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا، چلو آؤ، ان سے بات کرتے ہیں۔ اگر وہ نہیں گئے ہوں گے ۔تو ہم انہیں ساتھ لے چلیں گے ۔اور اس جگہ کی ریت کھود کر دیکھ لیں گے۔

جھونپڑی سے باہر نکل کر ابی علتے سے ان سب کے نام لے لے کر باہر بلوایا، جن سے انہیں سخت نفرت تھی۔ وہ ان کے خلاف کسی منصوبے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ منتاج، بدر زاد، فیروز اور بشار کے نام اُس نے کئی بار پکارے۔ یہ چاروں افراد اور ان کے ساتھی الگ سے وارداتیں کرنے کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ پھر ان کی بیویاں بہت خوبصورت اور پرکشش تھیں۔ ابی علتے بہادر اور طاقتور ہونے کے باوجود کئی مرتبہ بدرزاد اور فیروز سے پٹ چکا تھا۔ لیکن اس کے دل میں کینہ اس کے لہو کو گرمائے رکھتا تھا۔ سیاہ خیمہ کے واقعے کو وہ واردات بنا کر اپنی ایک جنگ جیتنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ سارے مرد جمع ہو گئے تو وہ طنز اور طعنوں کے نشتر چلاتے ہوئے بولا ہم سب کو ایک دوسرے کا وفادار ہونا چاہیے ۔ میں اگر مہم پہ نکل گیا تھا۔ تو میں نے واپس بھی تو آنا تھا لیکن میں جب بھی کسی مہم کیلئے نکلتا ہوں ۔تو کچھ لوگ میرے مرجانے ،اور قتل ہو جانے کی دُعا مانگتے ہیں حالانکہ میں جو کچھ بھی سمیٹ کر لوٹتا ہوں ۔ میں تم سب کا حصہ رکھتا ہوں۔ ہم سب ایک دوسرے سے مدد حفاظت اور اخلاص کی توقع رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کا حاسد بن کر ہم صرف تباہ ہو سکتے ہیں۔

بشار خشک بیر چھپاتے ہوئے سختی سے بولا، اصل بات کی طرف آؤ۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے ۔اور ہم تمہارے رحم وکرم پر نہیں ہیں۔ تم تو یوں تقریر کرنے لگے ہو جیسے نبی ہونے کا دعویٰ کرتے آئے ہو بشار کی باتوں سے ابی علتے سلگ کر رہ گیا۔ وہ تھوڑی دیر خاموشی بشار کو گھورتا رہا۔ اور پھر کسی سپہ سالار کے انداز میں بولا، تم جب بھی میرے سامنے آ جاتے ہو۔ مجھے تمہاری تاریخ اور نسل پہ غصہ آ جاتا۔ تمہارے باپ کی بھی تمہاری طرح ہری آنکھیں تھیں۔ جو میرے چچا کے ساتھ مہم پہ نکلا تو دھوکہ کر کے اسے قتل کر کے اسکی کنیز لے بھاگا۔ لیکن میرے باپ نے آخر بدلہ لے لیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری آنکھیں ہری کیوں ہیں۔ اور ہری آنکھوں والے پہ میرے خاندان کے لوگ اعتبار بھی نہیں کرتے ۔بات دراصل یہ ہے کہ بستی کے بچوں نے یہاں سے دور ایک سیاہ خیمہ دیکھ لیا تھا ان بچوں میں تمہارے بچے زیادہ تھے۔ اگر تم لوگوں نے اس خیمے پر واردات نہیں کی تو اچھی بات ہے۔

میں تم سب کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دیتا ہوں کیونکہ اکثر خیموں کے اندر لوگ گہرائی میں ریت میں اپنی قیمتی چیزیں دبا دیتے ہیں ۔ تاکہ راہزنوں اور ڈاکوؤں سے محفوظ رہیں اگر تم لوگوں نے ہم سے پہلے واردات کر لی ہے تو میں اور میرے خاندان کے سب مرد اس طرح سے تم سے اپنا حصہ لینے کا حق رکھتے ہیں ۔ اگر تم نے کوئی ایسی واردات نہیں کی تو پھر آؤ چلتے ہیں۔ اور سیاہ خیمہ اکھاڑ کے لے آئیں گے ۔اور ریت بھی دبی ہوئی چیزیں بھی ڈھونڈ لیں گے۔ اس وقت ہمارے پاس اتنا اناج اور ضرورت کی چیزیں موجود ہیں کہ ہمیں اگلے کئی دن تک کسی واردات کی ضرورت نہیں۔ بدرزاد دلیری سے قدم بڑھاتے ابی علتے کے پاس آ کر بولا، ہم اپنے بچوں اور بیویوں کے ساتھ آرام اور راحت کا وقت گزارنا چاہتے ہیں۔ ہم نے ایسا کوئی خیمہ نہیں دیکھا اور اگر بچوں نے دیکھا ہے۔ تو ہم نے کوئی کچھ سوچا نہیں۔ ایسے خیمے عام طور پر جنوں، بھوتوں اور چڑیلوں

کے ہوتے ہیں۔ جن میں انسانوں کے لیے مصیبتیں اور نحوستیں موجود ہوتی ہیں۔ میں اکیلا جانے کے لیے تیار ہو جانا۔ لیکن مجھے مہم سے واپس آئے ہوئے صرف پانچ دن ہوئے ہیں۔ میں تھکا ہوا بلکہ اکتایا ہوا سا ہوں۔ پھر بھی اپنے خاندان کا ایک فرد تمہارے ساتھ بھیجنے کو تیار ہوں۔ اس نے فیروز کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے رضامندی کی خواہش میں اسکی طرف بزرگانہ شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

بستی کے دوسرے لوگ اس مہم کے لیے تیار نہ تھے۔ چنانچہ ابی عنتے ،متولی اور متولی کا بیٹا حاسان اور فیروز نے اگلی صبح سیاہ خیمے کی طرف جانے کا طے کرلیا۔ خود کو اونچا اور رعب دار رکھنے کے لیے ابی عنتے نے بشار کا اونٹ مانگ لیا۔ باقی تینوں نے تیز رفتار گھوڑوں کو ترجیح دی۔ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے وہ صحرا میں اُترے تو خیمہ موجود نہ تھا لیکن وہ خیمے کے مقام پر پہنچ ریت چھاننا چاہتے تھے۔ وہ سیاہ اور بڑے بڑے گول پتھروں کے پاس جا پہنچے۔ چاروں نے اپنے ہاتھ گہرائی تک ریت میں ڈال کر مال ڈھونڈنا شروع کیا۔ بہت دیر تک مشقت کرنے کے بعد جب کچھ نہ ملا۔ تو فیروز جھڑکتے ہوئے بولا ابی عنتے سے کہا تم جیسا حریص اور کمینہ آدمی ہمارے درمیان رہتا ہے۔ یہ ہمارے لیے بہت خطرناک بات ہے۔ تم نے فضول مشقت میں ڈال کر اپنے ساتھ بھی برا کیا۔ اور ہمیں تکلیف دے کر اچھا نہیں کیا۔ فیروز کی بات سے مشتعل ہو کر ابی عنتے نے اپنا خنجر نکالتے ہوئے کہا۔ تم مکار ،لالچ اور بدنیت خنزیر کی نسل ہو۔ تم اور تمہارے بھائی پہلے ہی سے یہاں سے چیزیں نکال کر لے جا چکے ہو۔ تم ہمیں فریب دینے کے لیے ہمارے ساتھ ہو لیے تھے۔ فیروز نے دانت پیستے ہوئے کہا اگر ایسا ہوتا تو میں ابھی اور اسی وقت اس بات کا اقرار کر لیتا۔ میں تم سے ڈرتا تو نہیں کیا ہم اپنے اعمال کے لیے تم سے کسی اجازت طلب کرنے کے پابند نہیں۔ ابی عنتے نے اُسے گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔ ہاں تم ہم سے کم تر ہو اسلیے ہم سے اجازت لینے کے پابند ہو۔ فیروز نے اچھل کر ابی غصے کی گردن دبوچ لی۔ اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں سے گھورتے ہوئے ابی عنتے نے متولی کی طرف دیکھا متولی چند لمحے کے توقف کی بعد آگے بڑھا اور اس نے اپنا نیزہ فیروز کی پیٹھ میں اتنی طاقت سے مارا کہ وہ اس کا سینہ خون اچھالتا ہوا باہر نکل آیا وہ تینوں کچھ دیر اُسے تڑپتا ہوا دیکھتے رہے پھر انہوں نے گہرا گڑھا کھود کر اُسے بہت اچھے طریقے سے ریت میں ہمیشہ کے لیے گم کر دیا۔ پھر تینوں نے قریب پڑے ہوئے سیاہ پتھروں کو بہت دور ریت میں دبا دیا۔ ریت پر خون اور قدموں کے نشان غائب کرتے ہوئے پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ التجا کرتے ہوئے ابی عنتے نے کہا۔ تم دونوں کو روپوش ہونا پڑے گا تا کہ میں سب کو یہ بتا سکوں کہ فیروز تمہارے ساتھ سیاہ خیمے کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں کہہ دوں گا کہ ہم نے خیمہ دیکھ لیا تھا۔ ہم اس کے قریب جاتے۔ خیمہ آگے سرک جاتا۔ میں کہہ دوں گا میرے روکنے کے باوجود فیروز نہ مانا اور وہ تمہیں مجھ سے زبردستی کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ میں چند دنوں کے بعد تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ اور فیروز کے بارے میں ہم پھر نئی کہانی بنا لیں گے۔ دھوپ تیز ہو چکی تھی۔ لیکن متولی اور حاسان کو اپنی اور ابی عنتے کی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ مصلحت یہی تھی کہ وہ ابی عنتے کی بات مان لیں۔ چنانچہ وہ دونوں ابی عنتے کی پیٹھ کی جانب نامعلوم منزل کی طرف گھوڑے دوڑاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہونے لگے تو ابی عنتے نے بستی میں پہنچ کر سنانے والی کہانی کو مؤثر اور سچا بنانے کی مشق شروع کر دی۔ وہ کہانی سناتا جا رہا تھا کہ اس کا اونٹ تپتی دوپہر میں دھندناتا ہوا بستی کے قریب پہنچ گیا۔ بستی کی جھونپڑیاں اور گرم ریت پہ کچھ شریر بچے اُسے نظر آنے لگے۔ دوڑتے ہوئے اونٹ کی پیٹھ پہ بیٹھے بیٹھے ابی عنتے نے ایک لمبی آہ بھر کے بھاگتے ہوئے اونٹ کی باگیں اتنے دور کھینچیں کہ اونٹ ہانپتے ہوئے ایک طرف جھک گیا۔ ابی ابی عنتے نے یتیم بچوں کی طرح سسکنے لگا۔ اُس نے بستی کے قریب فیروز کا گھوڑا دیکھ لیا تھا۔ جو آہستہ آہستہ سر جھکائے ہوئے بچوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ابی عنتے نے چیختے ہوئے اونٹ کو واپس موڑا۔ پھر اس نے اونٹ کو کوڑے مارنا شروع کیے۔ تو اونٹ برق رفتاری سے گرم ریت پہ دوڑنے لگا۔ ابی عنتے چیختا جا رہا تھا۔ میں فوج لے کر اس بستی پر حملہ کروں گا۔ مجھے پوری بستی پہ حملہ کرنا پڑے گا۔ تا کہ میں اپنے بیوی بچوں اور کنیزوں کو آزاد کرا سکوں۔ وہ خود کو کسی بڑے اور طاقتور فوج کے سردار کے روپ میں سوچتے ہوئے سورج کی سمت اونٹ دوڑائے جا رہا تھا۔ اُس نے اچانک اُونٹ کو چھڑی سے مارنا شروع کر دیا اور اُسے حکم دیتے ہوئے چیخا مجھے اُس طرف لے چل جہاں دیوتاؤں کے پجاری کسی دیوتا کے منتظر ہو میں کسی دیوتا کا اوتار ہوں ۔میں زمین پر دیوتاؤں کی مرضی اور خواہش کے مطابق لوگوں کے جینے اور مرنے کا اہتمام کروں گا میں دیوتاؤں کا اوتار ہوں وہ چیختے چیختے اپنے اونٹ سمیت ریت کے ایک طوفان میں گم ہو گیا۔ اور پھر بہت دیر بعد بچوں نے بستی کی طرف اکیلے اونٹ کو دوڑتے ہوئے دیکھا۔

✧✧✧

دائرہ

عالیہ ذوالقرنین/ لاہور

ہوا میں ریت کے ذرات اڑتے پھر رہے تھے۔ تھکا ہارا سورج، جو دن بھر کی مشقت کے بعد اب کچھ دیر آرام کی غرض سے نیالی روشنی بکھیرتا دھیرے دھیرے مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زمین کی تپش بھی اب کچھ کم ہوتی معلوم ہو رہی تھی، مگر ہوا میں بکھری گرد ایک انجانے خوف کا پیش خیمہ نظر آ رہی تھی۔

دانیال نے اپنی آستین سے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا اور کھنڈر کے بیچوں بیچ، زمین پر جھک کر نرمی سے برش چلانے میں مصروف ہو گیا۔ اس کے سامنے بوسیدہ اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر تھے، جن پر وقت نے اپنے نقوش کندہ کر دیے تھے۔ یہ مقام، جو آج ویران اور سنسان تھا، کبھی کسی تہذیب کا مرکز رہا ہوگا مگر کون سی تہذیب؟ کون لوگ یہاں بستے تھے؟ وہ کیوں اور کیسے ختم ہو گئے؟

یہی وہ سوالات تھے جن کے جواب دانیال پچھلے پانچ دنوں سے تلاش کر رہا تھا۔

یہ کھنڈر صدیوں پرانا تھا، اس کے متعلق بہت کم معلومات دستیاب تھیں۔ تاریخ دانوں کے مطابق، یہ بستی کسی نامعلوم وجہ سے اچانک تباہ ہو گئی تھی۔ مقامی لوگوں میں اس جگہ کے متعلق کئی پراسرار کہانیاں مشہور تھیں۔ کچھ کہتے تھے کہ یہاں پرانے وقتوں میں کسی نے ایک بددعا دی تھی، جس کے بعد یہ جگہ غیر مرئی قوتوں کے قبضے میں چلی گئی۔ کچھ کا ماننا تھا کہ یہ بستی کسی خوفناک بیماری کے باعث اجڑ گئی۔ مگر دانیال کے لیے یہ سب محض افسانے تھے۔ وہ حقیقت کو کھوجنا چاہتا تھا۔

آج کا دن بھی باقی دنوں کی طرح مایوس کن ثابت ہو رہا تھا۔ وہ کئی گھنٹے کی محنت کے باوجود کچھ خاص نہ پا سکا تھا۔ لیکن جیسے ہی اس کا برش زمین کی سخت سطح سے ٹکرایا، اسے احساس ہوا کہ نیچے کچھ مختلف ہے۔

اس نے احتیاط سے مٹی ہٹائی تو ایک پتھریلی تختی ظاہر ہوئی۔

دانیال کی سانس رک سی گئی۔ تختی پر کچھ الفاظ کندہ تھے جو وقت کی مار سہہ کر مدھم پڑ چکے تھے، مگر جیسے ہی روشنی اس پر پڑی، حروف آہستہ آہستہ واضح ہونے لگے۔

”دانیال ابن......“

دانیال کا دل زور سے دھڑکا۔

”یہ...... یہ کیسے ممکن ہے؟“ وہ بے اختیار بڑبڑایا۔

یہ نام......اس کا اپنا نام تھا!

رات کے سائے خیموں پر لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی، اور ریت کے ذرات کبھی کبھار جھونکوں کے ساتھ اڑ کر خیمے کی چمڑے کی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔ دانیال نے خیمے کے اندر مشعل جلائی اور تختی کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس پر مزید کچھ لکھا ہوا تھا، مگر الفاظ اتنے دھندلے تھے کہ وہ انہیں مکمل طور پر پڑھنے سے قاصر تھا۔

وہ بے حد تھک چکا تھا، مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن میں عجیب و غریب خیالات گردش کر رہے تھے۔ کیا یہ تختی محض اتفاقی دریافت تھی، یا اس کا اس سے کوئی گہرا تعلق تھا؟ کیا یہ محض کوئی پرانی قبر کی نشانی تھی، یا اس کے پیچھے کوئی چھپی ہوئی حقیقت تھی؟

جب آنکھیں بوجھل ہونے لگیں تو وہ بستر پر لیٹ گیا۔ خیمے کے باہر ہوا کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔ آنکھیں بند ہونے لگیں، مگر اچانک......

”دانیال......“

ایک سرگوشی!

وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ خیمے کے اندر کچھ نہیں تھا۔

باہر ہوا اب بھی سنسان انداز میں چل رہی تھی۔

اس نے مشعل اٹھائی اور خیمے سے باہر نکلا۔ کھنڈر کی طرف دیکھتے ہی اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

وہاں، عین اس جگہ جہاں اس نے تختی نکالی تھی، ایک دھندلی سی روشنی لرز رہی تھی!

اس کے قدم خود بخود اس سمت بڑھنے لگے۔ قریب جا کر اس نے تختی کو دوبارہ دیکھا، اور حیران رہ گیا! روشنی میں کچھ اور الفاظ نمایاں ہو رہے تھے، جو پہلے نظر نہیں آئے تھے!

وہ مشعل کو اور قریب لے آیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ تختی پر ہاتھ رکھا۔

اچانک......

ایک زوردار جھماکا ہوا!

روشنی اس قدر تیز تھی کہ دانیال کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ پیچھے ہٹنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ زمین اس کے پیروں تلے لرزنے لگی۔

اسے لگا جیسے وہ کسی اندھیری کھائی میں گر رہا ہو۔

اور پھر چاروں طرف سکوت تھا۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں، تو وہ وہیں نہیں تھا جہاں وہ تھا۔

اس کے سامنے ایک عظیم الشان شہر تھا، اینٹوں کے بلند و بالا مینار، بازاروں میں لوگوں کی چہل پہل، اور ہواؤں میں کسی نامعلوم ساز کی دھن۔

یہ کہاں آ گیا تھا؟

دانیال نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا،بی وہی تھے، لیکن لباس بدلا ہوا تھا۔ گرد و غبار میں لپٹے کیمپ، جدید کھدائی کے اوزار، اور وہ پرانا کھنڈر...... سب غائب ہو چکے تھے۔

یہ وہی جگہ تھی، لیکن کسی اور وقت میں!

اچانک، ایک آواز آئی، ''دانیال!''

وہ مڑا، اور جو چہرہ اس کے سامنے تھا، وہ دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

یہ وہ خود تھا!

مگر یہ کیسے ممکن تھا؟

ہوا میں بکھری صندل اور زعفران کی خوشبو، پتھروں سے بنی بلند عمارتیں، اور بازاروں میں گونجتی صدائیں بی یہ سب کچھ دانیال کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ وہ کھنڈر میں تھا، ایک خستہ حال جگہ، جہاں وقت کی چاپ بھی ماند پڑ چکی تھی۔ لیکن اب......

یہ جگہ زندہ تھی!

اس کے سامنے وہی گلیاں، وہی دروازے، وہی عمارتیں موجود تھیں جو کھنڈر کی شکل میں اس نے دیکھی تھیں، مگر وقت کی گرد ہٹ چکی تھی۔ لوگ سفید اور نیلے چغے پہنے، سر پر مخصوص ٹوپیاں رکھے ادھر ادھر جا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ایک عجب سی سنجیدگی تھی، جیسے وہ کسی بہت بڑے راز کے امین ہوں۔

''دانیال!''

وہ گھوم کر دیکھنے لگا۔

آواز دینے والا خود اس کا عکس تھا!

وہی چہرہ، مگر لباس الگ، آنکھوں میں صدیوں کی تھکن اور سوچوں کا سمندر۔

دانیال کے قدم منجمد ہو گئے۔

''یہ خواب ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔

مگر اس کے پیروں تلے زمین بالکل ٹھوس تھی، دھوپ کی تپش اس کی جلد پر محسوس ہو رہی تھی، اور ہوا میں بکھری عطر کی مہک مکمل طور پر حقیقت کا حصہ لگ رہی تھی۔

''تمہیں میرے ساتھ آنا ہوگا!'' اس کے ہم شکل نے سرگوشی کی، جیسے وقت بہت کم ہو۔

''تم کون ہو؟'' دانیال کی آواز میں لرزش تھی۔

''میں وہی ہوں جو تم ہو!''

دانیال کا دل زور سے دھڑکا۔ وہ شخص پلٹا اور آگے بڑھنے لگا۔ دانیال کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

وہ ایک طویل راہداری سے گزر رہے تھے۔ دیواروں پر عجیب و غریب علامات کندہ تھیں۔ دانیال کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ سب کچھ سمجھ سکتا تھا، جیسے یہ الفاظ کسی اور نے نہیں، خود اس نے لکھے ہوں!

''ہم کون ہیں؟ ہم کہاں سے آئے؟ ہم کہاں جائیں گے؟''

یہی سوالات تو ہمیشہ اس کے ذہن میں گونجتے رہے تھے۔

''تمہیں ایک راز معلوم کرنا ہوگا!'' وہ ہم شکل رک گیا۔'' یہ شہر ہمیشہ یہاں تھا، مگر یہ ہمیشہ نہیں رہے گا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وقت کے دھارے میں کوئی ایک لمحہ ایسا آئے گا جب سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ ہم نے وہ لمحہ ٹالنے کی کوشش کی، مگر......''

''مگر کیا؟'' دانیال نے اضطراب سے پوچھا۔

''مگر تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ جو کچھ پہلے ہوا، وہ پھر ہونے والا ہے!''

دانیال کے ذہن میں ایک جھما کا سا ہوا۔ ''کیا تم کہہ رہے ہو کہ میں ماضی میں نہیں آیا...... بلکہ''

''بلکہ تم ہمیشہ سے یہاں تھے!''

دانیال کے اندر ایک عجیب سی بے چینی پھیل گئی۔ وہ کون تھا؟ کیا وہ واقعی اس جگہ کا حصہ تھا؟ اگر ہاں، تو پھر اس کا ''ماضی'' کیا تھا؟ اور جو کھنڈر اس نے دیکھے تھے، وہ کیا تھے؟

کیا یہ سب کچھ ایک دائروی وقت تھا؟ کیا وہ ماضی میں آیا تھا، یا یہ سب کچھ پہلے بھی ہو چکا تھا اور وہ ایک بار پھر اس سب کو دہرا رہا تھا؟

اس کے دماغ میں سوالات گونجنے لگے۔

اور تب......

دروازہ کھلا۔

دانیال کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ سامنے ایک ہال تھا بی وسیع، پراسرار اور روشنی سے بھرپور، مگر وہ روشنی قدرتی نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دیواروں میں روشنی سانس لے رہی ہو، دھیرے دھیرے مدھم اور تیز ہو رہی ہو۔

ہال کے بیچوں بیچ ایک ستون تھا، جس پر کوئی قدیم تحریر کندہ تھی۔ وہی زبان، جو دانیال کے لیے اجنبی ہونے کے باوجود مانوس محسوس ہو رہی تھی۔

''یہ کیا جگہ ہے؟'' دانیال نے سرگوشی کی۔

اس کا ہم شکل مسکرا دیا، مگر اس مسکراہٹ میں ایک گہرا دکھ تھا۔'' یہ وہ جگہ ہے جہاں سب ختم ہوتا ہے...... اور جہاں سب شروع ہوتا ہے۔''

دانیال نے ستون کو غور سے دیکھا۔ اس پر ایک نام لکھا تھا بی

''دانیال ابن......''

مگر آخری حصہ مٹا ہوا تھا۔

اس کے ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ کیوں وہ اس جگہ پر تھا؟ کیوں وہ زبان سمجھ سکتا تھا؟ اور سب سے اہم...... اس کا آخری نام کہاں گیا؟

''یہاں جو بھی آتا ہے، اپنا نام چھوڑ کر جاتا ہے۔'' اس کے ہم شکل نے دھیرے سے کہا۔ ''یہ جگہ وقت کی قید سے آزاد ہے، مگر ایک قیمت پر۔''

''کون سی قیمت؟''

ہم شکل آگے بڑھا، اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ ''یادداشت کی قیمت۔ جو یہاں آتا ہے، وہ واپس نہیں جاسکتا۔ اور اگر جائے تو......''

''تو کیا؟'' دانیال نے بے قراری سے پوچھا۔

''تو وہ اپنے وجود کا ایک حصہ یہیں چھوڑ جاتا ہے۔ اس کا نام، اس کی پہچان، اس کا ماضی......''

دانیال کا دماغ سن ہوگیا۔

اگر وہ واپس جاتا ہے تو وہ وہی نہیں رہے گا۔ وہ شاید دانیال تو ہو، مگر کون سا دانیال؟ وہ جو اس دنیا میں آیا تھا؟ یا وہ جو صدیوں سے یہاں موجود تھا؟

یہ ایک دائرہ تھا۔

ایک بھول بھلیاں۔

اور وہ...... وہ صرف ایک سفر کرنے والا نہیں تھا، بلکہ شاید...... ایک بار پھر وہیں پہنچ چکا تھا جہاں سے سب شروع ہوا تھا۔

''اب فیصلہ تمہارا ہے، دانیال!'' ہم شکل کی آنکھوں میں ایک پراسرار چمک تھی۔ ''یہ دروازہ ابھی کھلا ہے، مگر ہمیشہ نہیں رہے گا۔ یا تو واپس جا کر اپنا سب کچھ کھو دو...... یا یہیں رہو، اور وقت سے آزاد ہو جاؤ!''

دانیال کا سانس رُک گیا۔

کیا وہ واپس جائے؟ یا ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جائے؟

دانیال کی پلکیں لرزتی ہوئیں کھلیں۔

دانیال کی نظریں ستون پر جم گئیں۔ اس کا آخری نام غائب تھا، جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے ساکت کھڑا رہا، جیسے وقت نے اس پر اپنا جادو کر دیا ہو۔

''یہاں رک جاؤ، تو تم ہمیشہ کے لیے اس راز کا حصہ بن جاؤ گے۔'' ہم شکل نے کہا۔ ''اور اگر واپس جاؤ گے تو شاید تم کچھ یاد نہ رکھ سکو۔''

دانیال کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ کیا وہ واپس جا سکتا تھا؟ اگر ہاں، تو کیا وہ دانیال رہے گا؟

اس نے اپنی ہتھیلی کو دیکھا۔ لکیریں دھندلا رہی تھیں، جیسے کوئی انہیں مٹا رہا ہو۔

''فیصلہ کرو، دانیال!''

دانیال نے ایک گہری سانس لی۔

''میں واپس جانا چاہتا ہوں۔''

ہم شکل نے اسے غور سے دیکھا، جیسے وہ اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے......'' اس کی آواز میں ایک پراسرار اداسی تھی۔ ''مگر یاد رکھو، جو کوئی واپس جاتا ہے، وہ کچھ نہ کچھ یہیں چھوڑ دیتا ہے۔ تم بھی جاؤ گے، مگر تم مکمل نہیں رہو گے۔''

دانیال کی نظریں ایک بار پھر ستون پر گئیں۔ اس کا نام، جو کبھی مکمل تھا، اب ادھورا تھا۔

اور پھر اچانک......

اس کے ارد گرد نمی بھری ہوا تیر رہی تھی۔ کھنڈرات کی خاموش دیواریں وقت کے بوجھ سے جھکی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ کہیں دور سے چمگادڑوں کی بے ترتیب سرگوشیاں آ رہی تھیں۔ وہ ستون کے قریب کھڑا تھا، مگر ایک عجیب سی بے چینی تھی، جیسے کوئی چیز چھوٹ گئی ہو، جیسے کچھ کھو گیا ہو۔

''میں یہاں کیوں آیا تھا؟''

اس نے خود سے سوال کیا، مگر جواب ندارد۔ اس نے دیواروں پر ہاتھ پھیرا، ستون پر نظریں جمائیں، لیکن وہاں کچھ بھی تحریر نہیں تھا۔ نہ کوئی نام، نہ کوئی نشان بس صدیوں پرانی، خاموش پتھر کی سطح۔

''یہ جگہ اتنی جانی پہچانی کیوں لگ رہی ہے؟''

اس نے گردن جھٹکی، مگر ذہن ایک سفید کاغذ کی مانند تھا، جس پر ایک بھی حرف درج نہیں تھا۔

اس نے ہچکچاتے ہوئے قدم بڑھایا جیسے کسی خواب میں چل رہا ہو۔ اس نے گہری سانس لی اور یادداشت کے کسی بکھرے ہوئے ٹکڑے کو جوڑنے کی کوشش کی، مگر سب دھند میں گم تھا۔

''میں کون ہوں؟''

الفاظ اس کے لبوں سے نکلتے ہی ہوا میں تحلیل ہو گئے، جیسے وہ کبھی تھے ہی نہیں۔

اچانک، ایک مدھم سرگوشی ہوا میں بکھر گئی تھی ''نام کبھی مٹتے نہیں...... بس ان کی پہچان بدل جاتی ہے۔''

وہ لڑکھڑایا، اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ یہ آواز؟ یہ جملہ؟ کیا اس نے پہلے بھی یہ سنا تھا؟ کہاں؟ کب؟

اچانک، سب کچھ گھومنے لگا۔ ستون، دیواریں، وہ قدیم دروازہ.. سب ایک بھنور میں بدل گئے۔ روشنی اور تاریکی آپس میں گھل مل گئے، جیسے کسی نادیدہ قوت نے سب کچھ لپیٹ لیا ہو۔

اور پھر...... سکوت چھا گیا۔

وقت ایک دائرے میں قید تھا۔

کھنڈرات کے دروازے پر ایک نووارد کھڑا تھا۔ وہی پتھر، وہی دروازہ، وہی ہوا کی بوجھل سرسراہٹ کھنڈرات کی دیواروں پر شام کی روشنی پڑ رہی تھی۔ پرانی اینٹوں نے ایک اور راز اپنے اندر دفن کر لیا تھا۔ ساری مشقت ضائع گئی کھنڈرات کے راز کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا - دانیال نے آخری بار چاروں طرف دیکھا مگر اب اس کی آنکھوں میں کوئی پہچان باقی نہیں تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا--

وقت کا دائرہ گھوم رہا تھا مگر دانیال وہیں پہنچ چکا تھا جہاں سے سفر شروع ہوا تھا۔

ادبی تقریبات

حلقہ اربابِ ذوق ، لاہور کا سالانہ جلسہ ۲۷ اپریل کی شام الحمرا ہال نمبر ۲ میں منعقد کیا گیا۔ اسے اس سال کی سب سے بڑی تقریب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، شعراء و ادباء کی کثیر تعداد نے اس سالانہ جلسے میں شرکت کی۔ حلقہ کے سابق سیکرٹری جناب محمد نواز کھرل نے گزشتہ سال کی مکمل رپورٹ پیش کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حلقہ کا گزشتہ ایک سال نواز کھرل کی ان تھک محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے، انہوں نے بہت محنت و جانفشانی سے 58 تاریخی سیشن منعقد کئے اور حلقہ کی قدر و منزل میں بے پایاں اضافہ کیا۔ نواز کھرل کا بطور سیکرٹری دور ایک روشن دور تھا۔ اس سالانہ جلسہ کا صدارتی خطبہ جناب مرزا اطہر بیگ نے پیش کیا۔ اس کے بعد اقتدار کی منتقلی کا دور چلا سابق سیکرٹری جناب محمد نواز کھرل اور جوائنٹ سیکرٹری محمد احمد نے حلقہ کا رجسٹر نئی انتظامیہ سیکرٹری شازیہ مفتی اور جوائنٹ سیکرٹری سلمان رسول کو پیش کیا۔ اقتدار کی منتقلی کے بعد محفلِ موسیقی کا دور چلا جس نے سننے والوں کو سرشار کر دیا۔ ناصر بلوچ، اسامہ عباس، عدیل برکی، غلام عباس فراست، انجم شیرازی، اور استاد ندیم ریاض ملک نے سُر بکھیرے اور خوب داد سمیٹی۔ نواز کھرل نے ڈنر اور چائے کا بھی خوب اہتمام کر رکھا تھا۔

⊙⊙⊙

یو ایم ٹی ادبی بیٹھک گزشتہ کئی برسوں سے دبستانِ لاہور میں شعر و ادب کی خدمت میں پیش پیش ہے۔ مرحوم ڈاکٹر حسن صہیب مراد کا لگایا یہ پودا اب تناور درخت بن چکا ہے، ماضی میں کئی یادگار ادبی تقاریب یو ایم ٹی ادبی بیٹھک کے کریڈٹ پر ہیں۔ پہلے دن سے بھائی احمد سہیل نصر اللہ اس شاندار روایت کو بڑی عمدگی سے لے کر چل رہے ہیں، اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سہ پہر ماہِ یو ایم ٹی ادبی بیٹھک کے زیرِ اہتمام ایک پاک اور پرنور نعتیہ مشاعرہ جس کی صدارت نامور سینئر شاعر جناب حسن عسکری کاظمی نے کی، نظامت کے فرائض محمد افضل ساجد نے بہت عمدگی سے نبھائے، دیگر شعرائے کرام میں اعجاز کنور راجہ، محمد عباس مرزا، قاری صادق جمیل، واجد امیر، توقیر احمد شریفی، ڈاکٹر شاہد اشرف، عرفان صادق، کامران ناشط، درِ نجف زیبی، صائمہ آفتاب، اسرار چشتی، وسیم عباس، فرہاد ترابی، نعیم عباس ساجد، ڈاکٹر صغیر احمد صغیر، اظہر عباس، افضل پارس اور آفتاب جاوید شامل تھے۔

کرنل سخاوت بخاری نے ترنم سے معروف شعرا کی نعوت پیش کیں اور خوب داد پائی۔ دیگر صحافت اور سماجی شخصیات میں فرخ سہیل گوئندی، سلمان عابد، حسام درانی، عقیل انجم اعوان، عبدالماجد ملک، محمد اکرم، کنول بہزاد، منشا قاضی اور دیگر نامور ہستیاں شریک تھیں، ان کے ہمراہ طلباء و طالبات کی کثیر تعداد نے بہت منظم انداز میں اس پاک محفل میں شرکت کی۔ تمام ہی شعرائے کرام نے سیّد المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں گلہائے عقیدت پیش کئے اور یومِ شہادتِ حضرت علی علیہ السّلام کی مناسب سے بھی اشعار سنائے۔ ماشاءاللہ ایک بھرپور محفل جس میں ایک سے بڑھ کر ایک نعتیہ شعر سننے کو ملا سبھی شعرائے کرام نے لاجواب کلام سنایا اور خوب داد سمیٹی۔ تقریب کے اختتام پر شرکاء کے لئے شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ یونیورسٹیز میں ایسی ادبی تقاریب کا اہتمام قابلِ قدر بات ہے۔

⊙⊙⊙

گزشتہ دنوں پاک ٹی ہاؤس لاہور کے تاریخی مقام پر کینوس کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔

بانی و چیئرمین کینوس رائے وقار حسین کھرل کی اٹلی اور صدر وجاہت مشتاق گوندل کی آئس لینڈ موجودگی کی وجہ سے جنرل سیکرٹری کینوس لطیف ساجد نے معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔

عہد ساز شاعر عباس تابش، واجد امیر، اکرام عارفی، شہزاد نیر، نصیر احمد نصیر، عرفان صادق، خالد ندیم شانی، جاوید آفتاب، احتشام حسن، جی اے نجم، شبیر حیدر سمیت اردو ادب سے لگاؤ رکھنے والے افراد نے شرکت کی۔

معزز مہمانوں نے خطاب کرتے ہوئے کینوس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

کینوس کی ایگزیکٹو کمیٹی کے اراکین جناب رائے یار محمد، اٹلی، جناب فاروق چیمہ، اٹلی، جناب شفیق عبد الرزاق، اٹلی، جناب حاجی عمران، بیلجیم، رائے ساجد حسین کھرل، یونان، جناب فلک شیر گجر، یونان، جناب سید نجم الحسن کاظمی، امریکہ، جناب انصر فاروق باورا، امریکہ، اسد نواز تنگر، اٹلی، اظہر یار گوندل، اٹلی، ظہور احمد، جرمنی کی کاوشوں کو سراہا۔

شعبہ اردو، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد کے زیر اہتمام ممتاز دانشور، شاعر، محقق اور نقاد جناب ڈاکٹر تقی عابدی کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں کینیڈین سول ایوارڈ ''کنگ چارلس سوم ایوارڈ'' ملنے پر تقریب اعزاز منعقد ہوئی۔ صدارت: پروفیسر فتح محمد ملک اور پروفیسر جلیل عالی نے کی۔ مہمانان خصوصی:

جناب محمد حمید شاہد، پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیم مظہر، سربراہ، ادارہ فروغ قومی زبان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف رفیقی، سربراہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، پروفیسر ڈاکٹر اشرف کمال تھے۔

مہمانانِ اعزاز: ڈاکٹر فاروق عادل، پروفیسر سلمان باسط، جناب فدا محمد ناشاد، سابق اسپیکر، گلگت بلتستان، جناب اصغر علی گولو، سابق سفیر پاکستان، محترمہ عائشہ مسعود، محترمہ نعیم فاطمہ علوی، ڈاکٹر راشد حمید، جناب شاہد اقبال، ڈاکٹر سعدیہ طاہر، جناب سلیم اختر، پروفیسر احمد خان اعوان، محترمہ صبا صادق، ڈاکٹر شجاع عباس تھے۔

نظامت: ڈاکٹر شیر علی نے خوب صورت انداز میں کی۔

انٹرنیشنل اقبال سوسائٹی کے زیر اہتمام یومِ اقبال کے حوالے سے الحمراء میں ایک خصوصی تقریب منعقد ہوئی۔ یہ ہر لحاظ سے ایک شاندار تقریب تھی اور ایک رسمی کارروائی نہ تھی۔ نقابت زاہد شمسی ڈائریکٹر اقبال سوسائٹی نے بہت عمدہ طریقے سے کی۔ سب سے پہلے تو ایک پینل ڈسکشن تھی جس میں جناب امجد ثاقب، جناب ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، جناب سروش عالمگیر اور زاہد شمسی صاحب نے حصہ لیا۔ یہ ایک بہت مفید گفتگو تھی۔ امجد ثاقب صاحب نے بتایا کہ انھوں نے اپنے ادارے اخوت کی بنیاد مواخات مدینہ اور اقبال کی شاعری اور ان کے فکر و فلسفے سے متاثر ہو کر رکھی اور اب اس کے فنڈز 54 ارب روپے تک پھیل چکے ہیں۔ یہ ادارہ قرض حسنہ دے کر غربت کے عفریت سے لڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سروش عالمگیر اور ڈاکٹر تنولی نے بہت عالمانہ گفتگو کی۔ اس کے بعد ایک مشاعرہ تھا جس میں حمیدہ شاہین صاحبہ، گلزار بخاری، حسنین محسن اور زاہد شمسی نے علامہ اقبال کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ محترمہ حمیدہ شاہین اور گلزار بخاری نے تو سماں باندھ دیا۔ ڈاکٹر ضیاالحسن بھی تشریف لے آئے۔ تقریب کے دوران ان پلگ اور لمز یونیورسٹی کے طلبہ نے بہت ہی خوبصورت انداز سے کلام اقبال گا کر حاضرین سے بہت داد وصول کی۔ سوسائٹی کے صدر عمر رضا نے سوسائٹی کے مقاصد اور اس کے مختلف پروگراموں پہ روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ ان کا اگلا پروگرام اگلے ہفتے کینیڈا میں ہوگا۔ پروگرام کے آخر میں کلیدی خطاب جناب ڈاکٹر معین نظامی کا تھا۔ انھوں نے بہت دلنشیں اور عالمانہ انداز سے اقبال کے مثالی انسان کے تصور پہ روشنی ڈالی۔ ہال کھچا کھچ بھرا تھا اور کچھ لوگوں کو کھڑا ہونا پڑا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی جن کا جوش و خروش دیدنی تھا۔

⊙⊙⊙

اکادمی ادبیات پاکستان (پشاور) کے زیرِ اہتمام دو روزہ صوبائی کانفرنس بعنوان ''ادبیاتِ خیبر پختونخوا: معاصر تناظر'' کی تقریبات کا شاندار آغاز 29 اپریل 2025ء بروز منگل ہوا۔ افتتاحی تقریب کے مہمانِ خصوصی جناب فیصل کریم کنڈی، گورنر خیبر پختونخوا تھے، جنھوں نے ''خیبر پختونخوا رائٹرز ہاؤس'' کا باقاعدہ افتتاح کیا اور اکادمی ادبیات پاکستان کی علاقائی زبانوں و ادب کے فروغ کے ضمن میں کی جانے والی علمی و فکری کاوشوں کو سراہتے ہوئے ہر ممکن معاونت کی یقین دہانی کرائی۔ صدرِ تقریب، ڈاکٹر نجیبہ عارف، صدر نشیں، اکادمی ادبیات پاکستان نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں علاقائی زبانوں اور ادب کی تہذیبی، فکری اور ثقافتی معنویت کو اجاگر کیا۔ افتتاحی تقریب میں کلیدی خطبات ڈاکٹر نور الامین یوسفزئی (پشتو)، ڈاکٹر سلمان علی (اردو) اور جناب ماجد شاہ (ہندکو) نے پیش کیے، جن میں علاقائی ادبیات کے عصری تناظر اور علمی جہات پر روشنی ڈالی گئی۔ تقریب میں خانزادہ اسفندیار خٹک نے ثقافتی رقص کے ذریعے علاقائی ثقافت کا خوبصورت اظہار کیا، جب کہ اختتامی مرحلے میں ایک کثیر لسانی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں خیبر پختونخوا کی مختلف زبانوں کے تقریباً بیس نمائندہ شعراء نے شرکت کی۔ اس علمی و ادبی اجتماع میں صوبہ بھر سے آئے ہوئے شعراء، ادباء اور دانشوروں نے بھرپور شرکت کی۔

⊙⊙⊙

بہ یاد: سید قاسم محمود
Book Digest
ماہنامہ بک ڈائجسٹ لاہور پاکستان
ISSN 2079-4584
رسالے کے حصول کے لئے
سالانہ زرتعاون مبلغ -/2500 روپے
اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ درج ذیل
جاز کیش، یو پیسہ اکاؤنٹ میں جمع کرایا جا سکتا ہے
0321-4377794
paisa 0333-4377794
Mazhar Saleem Majoka
مدیر اعلیٰ: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر: اظہر سلیم مجوکہ
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کیلئے منظور شدہ
برائے خط و کتابت ترسیل زر/رابطہ
کتاب ورثہ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
042-37322996
0333-4377794
bookdigest@hotmail.com,kitabvirsa@gmail.com

نستعلیق پبلی کیشنز، جہاں الفاظ کو آبرو ملتی ہے

ادب کی خوشبو، لفظوں کی لطافت، اور خیالوں کی نزاکت کو دلنشین قالب میں ڈھالنے والا ایک معتبر نام

نستعلیق پبلی کیشنز

ہم محض کتابیں شائع نہیں کرتے، ہم خوابوں کو قرطاس پر لفظوں کی صورت سنوارتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہر تصنیف ایک فن پارہ ہوتی ہے۔

نستعلیق اُن اہلِ قلم کا انتخاب ہے جو اپنے لفظوں کو وہی وقار دینا چاہتے ہیں، جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

ہمارے ہاں معیارِ طباعت، حسنِ سرورق، ادبی شائستگی اور فروغِ ادب کی سچی لگن۔ یہ سب اقدار ایک ہی مقام پر یکجا نظر آتی ہیں۔

جہاں آپ کی تخلیق کو وہی عزت، محبت اور تہذیب عطا کی جاتی ہے، جو ایک سچے فن پارے کا حق ہے۔

اب یہی ہے آپ کی تخلیقی شناخت

نستعلیق
Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

جاپان اور پاکستان سے بیک وقت شائع ہونے والا

ماہنامہ ارژنگ، حرف و خیال کی ایک مہک دار دنیا

ادب وہ آئینہ ہے جس میں قوموں کی تہذیب، روح کی گہرائیاں اور فکر کی بلندی عکس بنتی ہے۔ اور ماہنامہ ارژنگ اس آئینے کو پچیس برسوں سے تھامے، جمالِ ادب کو محبت سے سنوارتا چلا آ رہا ہے۔ لاہور کی ادبی فضاؤں سے جنم لینے والا یہ ماہنامہ محض ایک رسالہ نہیں، بلکہ ایک علمی و ادبی تجربہ ہے جو قاری کو لفظوں کے معطر گلشن میں لے جاتا ہے۔ ارژنگ کی ہر اشاعت ایک فکری جشن ہے، جس میں

- نورِ نعت اور حمد کی پاکیزہ مہک
- تحقیق و تنقید کی گہرائی
- شاعری کی رنگینی و شگفتگی
- افسانوں کا جادو
- سفرناموں کی وسعت
- خاکوں کی نفاست
- ادبی تقریبات کی جھلکیاں
- کتابوں پر سنجیدہ تبصرے
- اور قارئین کے دل سے نکلے ہوئے خطوط

سب کچھ ایک ہی دامن میں سمٹ آتا ہے۔ یہاں سخن کے وہ دو چراغ بھی روشن کیے جاتے ہیں جو ہر شمارے میں کسی معتبر ادیب یا شاعر کی زندگی اور فکر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ انٹرویوز، جو قاری کو براہِ راست ان ادبی قد آور شخصیات سے جوڑتے ہیں۔

عامر بن علی جیسے بصیرت افروز مدیرِ اعلیٰ کی رہنمائی میں، حسن عباسی اور لبنیٰ صفدر کی ادبی نگاہ سے ترتیب پانے والا یہ رسالہ اردو ادب کے سنہرے قافلے میں ایک روشن مشعل کی مانند ہے۔ اگر آپ ادب سے محبت رکھتے ہیں، اگر آپ لفظوں کے لمس سے روح کو سرشار کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ اپنی نسل کو فکر و فن کی روایت سے آشنا کرنا چاہتے ہیں، تو ماہنامہ ارژنگ کی رفاقت سے بہتر کوئی انتخاب نہیں۔ سالانہ ممبرشپ صرف 1500 روپے۔ یہ کوئی قیمت نہیں، یہ تو لفظوں کی اس بزم میں شامل ہونے کا پاس ہے جہاں ادب جیتا ہے، سانس لیتا ہے، اور آپ سے ہمکلام ہوتا ہے۔

آئیے، ارژنگ کے قافلے کا حصہ بنیے۔ کیونکہ ادب صرف پڑھنے کا نام نہیں، جینے کا نام بھی ہے!

دفتر ماہنامہ ارژنگ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور 0300-4489310

CamScanner

پریس کلب بورے والا میں مجلس میاں محمد بخش کے زیر اہتمام

عامر بن علی کے نام ایک شام و مشاعرہ

صدر شام: عامر بن علی

صدارت: مسعود احمد

منتظمین:

حنیف صوفی

امجد خان تجوانہ

سجاد حسین ساجد

سفیان سیفی

عامر بن علی

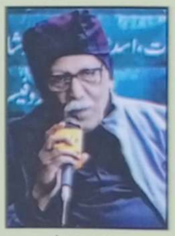

رمیض اقبال

جی اے نجم

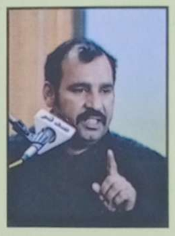

بدر سیماب

صفی ہمدانی

ڈاکٹر ندیم اکبر

علی کبیر

ڈاکٹر عابد شہزاد

پروفیسر امین انجم

عزیز اللہ عابد

روشان الحق لنگڑیال

اقبال غوری

منور شکیل

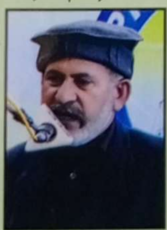

عبدالغفور

عبدالسلام دانش

گل جہان

سہیل ہارون

فائق احمد

عبدالحمید

اسد عباس اسد

برکت اللہ برکت

افتخار واجد

عاصم پڑھیار

پروفیسر عبدالرحمٰن

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com